ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ، اردو غزل کی روایت کے تناظر میں:
تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

(تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اُردو)

مقالہ نگار

اُلفت عباس

رجسٹریشن نمبر:130-FLL/MSURDU/F14

نگران

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

کلیۂ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Accession No. IH24736

MS
891.4391
الظ

۱. اردو شاعری ۔ تاریخ و تنقید
۲. اردو شاعری
۳. ظفر اقبال ۔۔۔ غزلیات کا جائزہ

ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ، اردو غزل کی روایت کے تناظر میں:

تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

(تحقیقی مقالہ)

مقالہ نگار

اُلفت عباس

رجسٹریشن نمبر: 130-FLL/MSURDU/F14

مقالہ برائے ایم ایس (اُردو)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم ایس (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

کلیۂ زبان و ادب

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایم ایس اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور MS اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ، اردو غزل کی روایت کے تناظر میں: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ**

مقالہ نگار: **اُلفت عباس**

رجسٹریشن نمبر: **130-FLL/MSURDU/F14**

کمیٹی دفاع مقالہ

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
چیئرمین
شعبۂ اُردو

پروفیسر ڈاکٹر ایاز افسر
ڈین
کلیہ زبان وادب

ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)
اسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر فرحت جبیں ورک
اسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
فاطمہ جناح یونیورسٹی، راولپنڈی
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
ایسوسی ایٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

اقرار نامہ

میں، اُلفت عباس، رجسٹریشن نمبر:130-FLL/MSURDU/F14 حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ بعنوان **"ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ، اردو غزل کی روایت کے تناظر میں: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"** میں پیش کیا گیا کام میری ذاتی کاوش ہے اور سرقے سے پاک ہے۔ میں نے یہ کام بین الاقوامی اسلامی، یونیورسٹی، اسلام آباد کے ایم ایس (اُردو) کے سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عزیز ابن الحسن کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ پیش کروں گا۔

اُلفت عباس

مقالہ نگار

تصدیق نامہ

اُلفت عباس نے رجسٹریشن نمبر:130-FLL/MSURDU/F14 کے تحت اپنا تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم ایس اردو بعنوان **"ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ، اردو غزل کی روایت کے تناظر میں: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"** میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ تحقیقی و تنقیدی حوالے سے ایم ایس کے معیار کے مطابق ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ مقالہ جانچ کے لیے ممتحنین کو بھجوا دیا جائے۔

29/10/2019

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

صدر شعبۂ اردو

کلیۂ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

فہرستِ ابواب

پیش لفظ vi

باب اوّل: ظفر اقبال: سوانحی و شعری تعارف ۱

(الف) سوانحی تعارف (ب) ادبی و شعری تعارف

باب دوم: استعارہ: نظری مباحث: اہلِ بلاغت اور اہلِ نقد کی نظر میں ۲۴

(الف) استعارہ: اہلِ بلاغت کی نظر میں

(ب) مغربی تنقید میں استعارے کے مباحث

(ج) اردو تنقید میں استعارے کے مباحث

باب سوم: ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ اور اُردو غزل کی روایت ۵۲

(الف) اردو غزل میں دل کے استعارے کی روایت (میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ)

(ب) ظفر اقبال کی استعارہ سازی

(ج) ظفر اقبال کی غزل میں دل کے استعارے کی روایتی جہات

باب چہارم: ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ: متنوع جہات ۸۶

(الف) دل، روحانیت کا استعارہ

(ب) دل کربلا کا استعارہ

(ج) دل کی استعاراتی تجسیم کاری

(دل جدید حسّیت اور عصرِ حاضر کے انسان کا استعارہ)

ماحصل: ۱۳۱

کتابیات: ۱۴۳

پیش لفظ

بیسویں صدی کے ربع سوم میں منظرِ عام پر آنے والے شعرا میں ظفر اقبال ایک اہم غزل گو شاعر ہیں۔ ظفر اقبال نے اس وقت اردو غزل کا چراغ روشن رکھا جب عمومی طور پر نظم کا شہرہ تھا اور غزل کو درخورِ اعتنا نہیں جانا جاتا تھا۔ اس عہد میں ادبی منظر نامہ اردو نظم کے بنیادی شاعروں کی کہکشاں سے جگمگا رہا تھا جن میں میرا جی، ن۔م۔راشد، فیض احمد فیض اور مجید امجد جیسے نابغے اپنا لوہا منوا چکے تھے اور سارے ادبی منظر نامے پر چھائے ہوئے تھے۔ ظفر اقبال کے مجموعے آبِ رواں کو ۱۹۶۲ء میں وہ پذیرائی ملی جس کا تصور بھی محال تھا۔ مگر ظفر اقبال نے گلافتاب کی صورت جب ادبی دھماکہ کیا تو اس کی گونج پاک و ہند میں سنائی دینے لگی۔ تعریف و تنقید کے کئی مباحث نے جنم لیا۔ ایک طرف اردو ادب کے چوٹی کے ناقدین نے اسے خُوب سراہا تو دوسری طرف ظفر اقبال کے خلاف ایک باقاعدہ محاذ کھل گیا۔ خود ظفر اقبال نے اسے اردو شاعری کے مستقبل کا منظر نامہ قرار دیا۔ بہر حال ظفر اقبال نے اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا اور نت نئے شعری تجربات سے اردو غزل کے دامن کو وسعت دینے کی خاطر کسی کو خاطر میں نہ لائے۔ زبان و بیان اور لسانی تشکیلات کے تجربات، موضوعات کا تنوع، اردو میں دیگر زبانوں کی پیوندکاری، منفرد اسلوب، جدید طرز احساس، تہذیبی و سماجی رچاؤ، استعارہ سازی اور لفظ کی نئی معنویت ان کی خاص پہچان ٹھہری۔ ظفر اقبال نے نصف صدی سے زائد اردو غزل کی آبیاری کی۔ چھیاسی سالہ یہ نوجوان بزرگ شاعر اس عمر میں بھی مسلسل اور بے تکان غزل کہہ رہے ہیں۔ اب تک کے عنوان سے ان کے ۵ ضخیم کلیاتِ غزل زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ان کا چھٹا کلیاتِ غزل مستقبل قریب میں آیا چاہتا ہے، مقدار کے اعتبار سے اردو غزل کی تاریخ میں ظفر اقبال کا کارنامہ اپنی جگہ ایک محیر العقول کارنامہ ہے جس کا مقابلہ ماضی یا حال کا کوئی بھی شاعر نہیں کر پایا اور مستقبل قریب میں بھی اس کا امکان محال ہی نہیں بلکہ اس مقصد کے لیے نصف صدی سے بھی زیادہ کی طویل ریاضت کا صبر آزما مرحلہ درکار ہو گا جو ظفر اقبال جیسا کوئی ان تھک اور پر گو شاعر ہی سرانجام دینے کی ٹھانے تو ممکن ہو سکتا ہے مگر معیار کا تعین وقت ہی کرتا ہے۔

ظفر اقبال کی انفرادیت کا ایک سبب ان کی استعارہ سازی بھی ہے۔ ہر بڑا تخلیق کار نئے استعارے تخلیق کرتا ہے اور پرانے استعاروں میں بھی نئی روح پھونکتا ہے۔ ظفر اقبال کے اشعار میں استعارے کی جانب میلان کا اندازہ ان کے اشعار سے بھی ہوتا ہے۔ ان کے بعض اشعار میں استعارہ بطور لفظ استعمال ہوا ہے۔ ان کا مجموعہ ھے ھنومان مکمل استعاراتی اظہار ہے۔ ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ صد ہا اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یوں ان کے کلام میں دل کئی استعاراتی رنگ بکھیرے ہوئے ہے۔ دل ظفر اقبال کا کلیدی استعارہ ہے۔ راقم الحروف کے مقالے کا عنوان ''ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ اردو غزل کی روایت کے تناظر میں: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' ہے۔ اس موضوع کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول ظفر اقبال کے شخصی و شعری تعارف پر مشتمل ہے۔ اس باب کے حصہ اول میں ظفر اقبال کا سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ خاندان، پیدائش، تعلیم، عملی زندگی، خانگی زندگی، ادبی زندگی، اعزازات و انعامات، صحافت و کالم نگاری پر نظر ڈالی گئی ہے جبکہ اسی باب کے دوسرے حصے میں ظفر اقبال کا تعارف ان کے کلام کی روشنی میں کرایا گیا ہے۔ اہم ناقدین کی آرا شامل کی گئی ہیں تاکہ ان کے شاعرانہ قد و قامت کا تعین کرنے میں آسانی ہو اور ظفر اقبال کی غزل کے عمومی مزاج اور اسلوب سے شناسائی حاصل کی جا سکے۔ باب دوم میں استعارے کے نظری مباحث زیرِ بحث لائے گئے ہیں اور استعارے کا اہل بلاغت اور اہل نقد دونوں کی آرا کی روشنی میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اہل نقد کے مباحث میں مغربی ناقدین سے بھی کسبِ فیض کیا گیا ہے اور استعارے کی تعریف کا تعین کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ باب سوم میں دل کا استعارہ اردو غزل کی روایت بالخصوص میر تقی میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے حوالے سے موضوع تحقیق و تنقید بنایا گیا ہے اور یہ کڑی ظفر اقبال سے ملاتے ہوئے انھیں اس روایت سے جوڑتے ہوئے اردو غزل کی روایت اور ظفر اقبال کی غزل میں دل کے استعارے کی روایتی جہات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ باب چہارم میں ظفر اقبال کی غزل میں دل کے استعارے کی متنوع جہات شامل ہیں۔ ظفر اقبال کا کلیدی استعارہ دل ہے۔ اور اس دل کی معنویت عصرِ حاضر کا انسان ہے۔

ظفر اقبال کی غزل کا مرکزی موضوع عصرِ نو کا انسان ہے۔ دل و دنیا کی کشمکش، دل روحانیت کا استعارہ، دل کربلا کا استعارہ اور عہدِ حاضر کے انسان کی معاشی، معاشرتی، سیاسی، نفسیاتی اور اخلاقی جہات

کو دل کے استعارے کے طور پر جانچا اور پرکھا گیا ہے اور دل کے استعارے اور معنویت کی ذیل میں تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے۔ ظفر اقبال کی غزل میں دل عصرِ حاضر کے جدید انسان کے استعارے کے طور پر اتنی بہتات سے استعمال کیا گیا ہے کہ ظفر اقبال کی غزل میں دل عصرِ حاضر کا انسان قرار پایا ہے۔

ایم ایس اردو کے دوران اصل مرحلہ موضوع کا انتخاب تھا۔ اس حوالے سے کئی موضوعات زیرِ غور رہے جب استاد محترم ڈاکٹر ضیاالحسن (اورینٹل کالج) سے مشورہ کیا اور مختلف موضوعات پر بات کی تو انھوں نے ظفر اقبال کی غزل میں استعارہ سازی پر تحقیقی و تنقیدی کام کا مشورہ دیا۔ اپنے مجوزہ نگران مقالہ سے جب موضوع کا اظہار کیا تو انھوں نے اس موضوع کی بھرپور حمایت کی۔ یوں اس موضوع پر مہرِ تصدیق ثبت ہوئی اور اس کام کی راہ ہموار ہوئی۔ راقم الحروف نے ڈاکٹر عزیز ابن الحسن صاحب کی زیرِ نگرانی اس لیے بھی کام کرنا پسند کیا کیونکہ راقم ڈاکٹر صاحب کی شگفتہ گفتگو، علمیت، زبان دانی، نکتہ سنجی، تنقیدی بصیرت اور ذوقِ شعر کا قتیل ہے۔ اگر ان کی شفقت اور رہنمائی نہ ہوتی تو مجھ ایسے سست الوجود شخص سے مقالے کی تکمیل قدرے مشکل کام تھا۔ میں اپنے نگرانِ مقالہ ڈاکٹر عزیز ابن الحسن صاحب کا تہہِ دل سے سپاس گزار ہوں۔ شعبہ اردو کے جملہ اساتذہ کرام، ڈاکٹر طیب منیر (مرحوم)، ڈاکٹر ارشد معراج صاحب، ڈاکٹر کامران کاظمی صاحب، ڈاکٹر روش ندیم صاحب، اور ڈاکٹر مظہر حسین طلعت صاحب کی محبت، شفقت اور رہنمائی پر تہہِ دل سے اظہار تشکر بجا لاتا ہوں اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کے تمام محترم اساتذہ کرام بالخصوص ڈاکٹر ضیاالحسن صاحب کے قیمتی مشوروں اور خصوصی محبت کا ہمیشہ مقروض رہوں گا۔

اپنے پیارے دوست پروفیسر عدنان بشیر کا ساتھ میرے لیے ہمیشہ راحتِ جاں اور سکون قلب کا باعث رہا۔ وہ مجھے نہ صرف کام پر اکساتے رہے بلکہ کمپوزنگ جیسے مشکل کام کا بیڑا بھی اٹھایا۔ اپنے دوست ڈاکٹر ذوالفقار علی، پروفیسر ثاقب آفتاب، محترم رفاقت راضی، ڈاکٹر سعید عاصم (لاہور) ڈاکٹر محمد نعیم (سرگودھا یونیورسٹی) ڈاکٹر ظہیر عباس (لاہور) عزیزم عدنان سرویا، عادل خان کموکا، علی خاقان، ولید بھٹی، سجاد سلمان، قلبِ عباس اور بھتیجے زاہد علی نقی کی دعائیں اور خدمات بھی شامل حال رہیں۔ ایم ایس اُردو کا یہ عرصہ عادل بادشاہ، ساجد اقبال، خالد محمود شاہ، آغا خاور نقوی اور ضیا افروز

اور دیگر ہم جماعت دوستوں کی رفاقت سے کشتِ زعفران بنا رہا اور محمد اسحاق خان کی محبتوں کا بہت شکریہ جنہوں نے مشکل وقت میں ہمیشہ ساتھ دیا۔ سب دوست سلامت رہیں۔

میں اپنی شریکِ حیات اور اہلِ خانہ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی دعاؤں اور نیک تمناؤں کے طفیل یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ میں اس موقع پر اپنے مرحوم والد کو یاد نہ کروں یہ ممکن ہی نہیں، آج اگر وہ حیات ہوتے تو سب سے زیادہ انھیں خوشی ہوتی کیونکہ انھوں نے مجھے ایم ایس، پی ایچ ڈی کی تکمیل سے قبل اپنے علاقے پلٹنے سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا اور ان کی شدید خواہش تھی کہ میں ان تعلیمی مراحل سے خود کو ضرور سرفراز کروں۔ ربِ کریم انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین!

میں یہ مقالہ اپنے محترم والد ملک غلام سرور لک کے نام معنون کرتا ہوں۔

میں نے اپنی طرف سے بھرپور کوشش کی ہے کہ تحقیقی و تنقیدی کام پوری دیانتداری، محنتِ شاقہ اور ذوقِ سلیم سے کیا جائے میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ٹھہرا اس کا فیصلہ اہل علم و بصیرت ہی کریں گے۔ بقول ظفر اقبال

اس دیگ میں پکا ہے جیسا بھی دال دلیا
ساروں پہ اس کا حق ہے ساروں میں لا رہا ہوں

اُلفت عباس

مقالہ نگار

باب اوّل۔ ظفر اقبال: سوانحی و شعری تعارف

(ا) سوانحی تعارف

اصل نام۔۔۔ قلمی نام۔۔۔ تاریخ و مقام پیدائش۔۔۔ ابتدائی و ثانوی تعلیم۔۔۔ پیشہ۔۔۔ سکونت۔۔۔ شادی۔۔۔ اولاد۔۔۔ عملی زندگی۔۔۔۔۔۔ صحافت۔۔۔۔ کالم نگاری۔۔۔۔۔ ملازمت۔۔۔۔۔۔۔ اعزازات۔۔۔۔ تصانیف۔۔۔۔۔ پنجابی شاعری۔۔۔۔۔۔ تنقید۔۔۔ مجموعہ جات و کلیاتِ غزل۔

(ب) ادبی و شعری تعارف

مقام و مرتبہ۔۔۔۔۔ زبان و بیان۔۔۔۔ اسلوب۔۔۔۔ موضوعات ۔۔۔ انفرادیت۔۔۔ شعری جھلک۔۔۔ شاعرانہ قد و قامت۔۔۔ اہل نقد کی نظر میں۔

۱۔ سوانحی تعارف

ظفر اقبال کا اصل نام میاں ظفر اقبال اور قلمی نام ظفر اقبال ہے۔ ظفر اقبال کا تعلق آرائیں سیاسی خانوادے سے ہے جس نے تقسیم ہند سے قبل انڈیا سے ہجرت کی۔ آپ کے والد کا نام میاں محمد شریف اور والدہ کا نام نور بیگم ہے۔ آپ کے والد صاحب کسان تھے لیکن سیاسی طور پر کافی فعال تھے۔ وہ سیاسی جماعت مسلم لیگ سے وابستہ رہے۔ اور اوکاڑہ میونسپل کمیٹی کے منتخب نائب صدر بھی رہے۔ ظفر اقبال کے چچا میاں عبدالحق تحریک پاکستان کے سرگرم فعال رکن تھے اور عرصۂ دراز تک مسلم لیگ میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ظفر اقبال نے بھی عملی سیاست میں حصہ لیا ور ضلع کونسل کا الیکشن لڑا۔ بعدازاں ۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا بھی الیکشن لڑا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ بعد ازاں سیاست پر تبصرہ اور کالم نگاری ان کا اک حوالہ بنا۔ ''ظفر اقبال ۲۷ ستمبر ۱۹۳۲ء میں ضلع بہاول نگر اپنے ننھال میں پیدا ہوئے''(۱)

ابتدائی تعلیم ایم۔بی۔ہائی سکول اوکاڑہ سے حاصل کی اور ۱۹۵۰ میں میٹرک کیا۔ اوکاڑہ کی زرخیز اور مردم خیز سرزمین سے ہی ان میں علم وادب کی چنگاری بھڑکانے میں ان کے ابتدائی کلاسوں کے استاد نور احمد انجم قریشی نے اہم کردار ادا کیا۔ یہ خود بھی شعر کہتے تھے اور بچوں کو بطور املا اشعار کی مشق کروایا کرتے تھے۔ آٹھویں جماعت تک میر و غالب کے دواوین ان کے زیرِ مطالعہ رہے۔ بعد ازاں لاہور تشریف لے گئے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے 1952 میں انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اس تعلیمی دورانیے میں انھیں لاہور کے دو تاریخی کالجوں میں باکمال اساتذہ سے تلمذ کا شرف بھی حاصل رہا اور بالترتیب ایک سال ایف۔ سی کالج لاہور اور دوسرا سال گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھنے کا موقع ملا۔ ایف۔ سی کالج سے ان کی ادبی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز ہوا اور فارسی زبان میں شعر موزوں کرنے کے بعد اردو شاعر دوستوں سے مسابقت کے جذبے نے اردو شاعری کو ظفریاب کرنے والے شاعر کو میدانِ عمل میں لا کھڑا کیا۔ اسی کالج سے ۱۹۵۶ء میں بی۔اے کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ان کے اساتذہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، خورشید کمال عزیز، قیوم نظر، مرزا مقبول بیگ بدخشانی نے ان کی علمی اور ادبی تربیت کی۔ بی۔اے کے دوران میں گورنمنٹ

کالج لاہور کے معروف مجلے راوی میں لکھنا شروع کیا۔ بی۔اے کے دوران میں انھوں نے سنجیدگی سے شعر وادب کے میدان میں قدم رکھا اور اس عرصے میں ان کا یہ شعر زبان زدِ خاص وعام ہوا۔

یہاں کسی کو بھی کچھ حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا

(آبِ رواں، اب تک، ظفر اقبال، کلیاتِ اول، ص ۸۴)

گورنمنٹ کالج کے ادبی دوستوں میں مظفر علی سید، ظفر صمدانی اور شہزاد احمد نمایاں احباب میں سے تھے۔ ظفر اقبال نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۹۵۸ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ لا کالج میں افتخار جالب سے گہری وابستگی کا آغاز ہوا۔ افتخار جالب اور ظفر اقبال نے کالج میگزین میزان شائع کیا۔ اوکاڑہ اور لاہور ہائی کورٹ پریکٹس کرتے رہے۔ عملی سیاست اور صحافت بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے بعد ازاں اوکاڑہ سے لاہور منتقل ہوگئے۔ اب شادمان، لاہور میں مقیم ہے۔ بقول ظفر اقبال:

لاہور کو بھی آن کے آباد کیا ہے
اور ساتھ ہی چھوڑا بھی اوکاڑہ نہیں میں نے

(تجویز، اب تک، ظفر اقبال، کلیات پنجم، ص ۴۰۳۱)

ظفر اقبال نے ۱۹۶۰ء میں دیپال پور میں بیگم شمع (شمیم اختر) سے شادی کی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں تین بیٹوں آفتاب اقبال، اویس اقبال اور جنید اقبال سے نوازا جبکہ ایک بیٹی بھی عطا کی جس کا نام عطیہ بانو ہے۔ وکالت کے ساتھ ساتھ ظفر اقبال صحافت میں بھی مصروف رہے۔ اور اوکاڑہ، لاہور کے تمام اخبارات میں لکھتے رہے انھوں نے ۱۹۷۲ء میں کالم نویسی کا آغاز ماہنامہ دھنک سے کیا بعد ازاں کاٹھ کباڑ، جناح، جنگ، نوائے وقت، آجکل، پاکستان، مشرق، خبریں میں کالم لکھتے رہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اس وقت دال دلیا کے عنوان سے ظفر اقبال کے کالم روزنامہ دنیا میں باقاعدگی سے چھپ رہے ہیں۔ ظفر اقبال نے اپنی خود نوشت در گذشت کے عنوان سے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے جو ادبی مجلے مکالمہ میں باقاعدگی سے شائع ہو رہی ہے۔ ظفر اقبال نے کالم میں سرخیاں اور

پیروڈی کو متعارف کرایا۔ خشتِ زعفران کے نام سے ان کے فکاہیہ کالموں کے دو انتخاب ۱۹۷۷ء میں چھپ چکے ہیں علاوہ ازیں دال دلیا کے عنوان سے کالموں کا انتخاب بھی شائع ہو چکا ہے۔

ظفر اقبال نے معروف ادبی پرچہ سویرا کی ادارت کے فرائض بھی سر انجام دیئے

مرا بیٹھا ہوں دیکھیں کب نکالیں
''سویرا'' کا ظفر اقبال نمبر

رطب و یابس، اب تک، ظفر اقبال، جلد اول ص، (۳۳۸)

''۱۹۹۵ء میں اردو سائنس بورڈ میں بطور ڈائریکٹر جنرل تقرر ہوا اور ۱۹۹۷ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔''(۲)

اس دوران میں انھوں نے اشاعتی سلسلہ بھی شروع کیا اور پچاس کتابوں کی سیریز کا آغاز کیا جو کچھ ان کے دور میں اور کچھ اب تک بھی چھپ رہی ہیں۔

''۱۹۹۹ء میں ظفر اقبال کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں صدارتی ایوارڈ ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' (۱۹۹۸-۱۹۹۷ء) سے نوازا گیا۔ (تمغہ حسن کارکردگی) کمال فن ایوارڈ (حکومت پنجاب) اور ہلال امتیاز سے بھی نوازے جا چکے ہیں''(۳)

ظفر اقبال نے پنجابی زبان میں بھی شاعری کی، ان کے پنجابی دو شعری مجموعے بکل اور کال بو لیندی کے عنوان سے شائع چکے ہیں۔ جبکہ پنڈو کڑی (پنجابی کلیات) بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ اپنی پنجابی شاعری میں ظفر اقبال نے پنجابی کلچر اور سماج کی شاندار عکاسی کی ہے۔

ظفر اقبال نے نظمیں بھی لکھیں جو سویرا، لیل و نہار، سات رنگ اور دیگر رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ اپنے ایک انٹرویو میں ظفر اقبال نے اظہار خیال کیا کہ:

''ان نظموں کی بیاض افتخار جالب مرحوم مجھ سے یہ کہہ کر اپنے ساتھ کراچی لے گئے تھے کہ یہ آپ سے گم ہو جائے گی لیکن دلچسپ بات یہ کہ وہ بیاض ان سے کہیں گم ہو گئی''(۴)

ظفر اقبال ریڈیو اور ٹی۔وی کے موضوعاتی مشاعروں کیلئے مرثیہ ، حمد اور نعت بھی غزل کے پیرائے میں لکھتے رہے ہیں جو اپنی جگہ انفرادیت کی حامل ہیں۔ اس کے علاوہ ظفر اقبال کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ لاتنقید کے نام سے شائع ہو چکا ہے جسے ظفر اقبال اپنے تاثرات کہتے ہیں جبکہ وہ اعلیٰ درجے کی تنقید ہے۔

ظفر اقبال کا پہلا شعری مجموعہ آبِ رواں کے نام سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا اور شعری افق پر چھا گیا۔ تب سے لے کر اب تک ظفر اقبال ادبی افق پر چھائے ہوئے ہیں اور انھیں رزق شعر بڑی وسعت اور فیاضی سے عطا ہو رہا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں کے عنوانات مع سنین درج ذیل ہیں۔

۱۔	آبِ رواں	۱۹۶۲ء	۲۔	گلافتاب	۱۹۶۶ء
۳۔	رطب ویابس	۱۹۷۰ء	۴۔	غبار آلود سمتوں کا سراغ	۱۹۹۰ء
۵۔	عیب و ھنر	۱۹۹۲ء	۶۔	ھے ھنومان	۱۹۹۵ء
۷۔	اطراف	۱۹۹۵ء	۸۔	وھم و گماں	۱۹۹۶ء
۹۔	تفاوت	۲۰۰۲ء			

۲۰۰۴ء میں ظفر اقبال نے اب تک کے عنوان سے کلیات غزل شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا جو اب تک جاری ہے اور ابتک ظفر اقبال کے پانچ ضخیم کلیات منظر عام پر آ چکے ہیں۔

۱۔ اب تک (کلیات غزل، ظفر اقبال (جلد اول) ۲۰۰۴ء ملٹی میڈیا افئیرز، لاہور

۱۔	آبِ رواں	۲۔	گلافتاب
۳۔	رطب ویابس	۴۔	غبار آلود سمتوں کا سراغ
۵۔	سرعام	۶۔	عیب وھنر

بقول شاعر علی شاعر:

''ظفر اقبال کے کلیات ''اب تک'' کی ۵ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہر جلد میں ۶ مجموعہ ءکلام، ہر مجموعے میں ۱۲۱ غزلیں، ہر غزل میں ۹ شعروں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یعنی ۳۰ مجموعے ہائے غزل، ۳۶۳۰ غزلیں، ۳۲۶۷۰ اشعار کہنے والا شاعر مقدار اور معیار، ہر دو لحاظ سے اردو شعر و سخن کی دنیا میں ایک ایسے بلند و بالا پہاڑ کی حیثیت رکھتا ہے جسے اسکی غیر معمولی اونچائی کے سبب سر نہیں کیا جا سکتا، ان کا غیر مطبوعہ اور پنجابی کلام اس اعداد و شمار کے علاوہ ہے''(5)

۲۔ اب تک (کلیات غزل) ظفر اقبال (جلد دوم) ۲۰۰۵ء ملٹی میڈیا افئیرز لاہور

۱۔ وھم و گمان ۲۔ اطراف

۳۔ ھے ھنومان ۴۔ تفاوت

۵۔ ترتیب ۶۔ تماشا

۳۔ اب تک (کلیات غزل، ظفر اقبال، جلد سوم) ملٹی میڈیا افئیرز، لاہور

۱۔ تمجید ۲۔ تقویم

۳۔ تشکیل ۴۔ تجاوز

۵۔ توارد ۶۔ تساھل

۴۔ اب تک (کلیات غزل، ظفر اقبال)، (جلد چہارم) ۲۰۱۲ ملٹی میڈیا افئیرز لاہور

۱۔ تنسیخ ۲۔ تحلیل

۳۔ تقلیل ۴۔ تخفیف

۵۔ ترکیب ۶۔ تشکیک

۵۔ اب تک (کلیات غزل، ظفر اقبال) (جلد پنجم) ۲۰۱۶ رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی

۱۔ تادیب ۲۔ تنصیب

۳۔ توسیع ۴۔ تفریق

۵۔ ترمیم ۶۔ تجویز

ان کلیات کے علاوہ دو اور اردو شعری مجموعے بھی شایع ہوے ہیں۔

۳۱۔توفیق، ظفر اقبال، رنگ ادب پبلی کیشنز، 2017، کراچی

۳۲۔تاخیر، ظفر اقبال، رنگ ادب پبلی کیشنز، ۲۰۱۸، کراچی

ظفر اقبال کی قادر الکلامی اور خوش بیانی کا سیلاب ابھی جاری ہے۔ ان کی ہمہ جہت ادبی شخصیت سے ابھی تک کئی خوش رنگ اور خوش نما سوتے پھوٹ رہے ہیں جو ان کے تخلیقی مزاج کے تسلسل کی دلیل ہیں۔

اب تک صرف اردو غزل کے ۳۲ مجموعے شائع ہو چکے ہیں، پنجابی شاعر نثری نظمیں، کالم اور تنقیدی مجموعے بھی چھپ چکے ہیں، غیر مطبوعہ کلام اس کے علاوہ ہے۔ مگر ظفر اقبال کی پہچان اور ادبی شخصیت کا مرکز و محور انکی غزل ہے، اپنی ضخامت اور انفرادیت کے حوالے سے حیران کن غزل، ہر لحہ ذائقے بدلتی ہوئی شاعری، ڈاکٹر عابد سیال اپنے مضمون ''ظفر اقبال کو پڑھتے ہوئے'' میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''ظفر اقبال کی شاعری کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ کتابیں آرٹ کے شوروم نہیں ہیں جیسا کہ اب ہمارے ہاں عام طور پر شاعری کی کتابوں کا رواج ہو گیا ہے ظفر صاحب کی کتابیں آرٹ سٹوڈیو ہیں۔ شوروم اور آرٹ سٹوڈیو میں فرق ہوتا ہے شوروم پر صرف تیار مال(First Product) رکھا جاتا ہے، سٹوڈیو، شوروم اور ورکشاپ کا مجموعہ ہوتا ہے جس میں تیار مال کے ساتھ اس میں استعمال ہونے والے مختلف مٹریل کہیں خام، کہیں نیم مکمل، کہیں مکمل مگر غیر مربوط میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں لیکن ان میں سے کسی بھی حالت میں ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کام کی چیز نہیں۔ یہ میٹریل بہر طور کام کی اشیاء ہوتے ہیں۔۔۔ یوں بڑے فن کار کا فیض اس کے اپنے بنائے ہوئے شہ پاروں ہی میں نہیں بلکہ اپنے

زمانے کے دیگر فن کاروں کی ہنر آزمائی میں بھی جاری نظر آتا ہے اور یہ بھی صاحب عہد کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔"(۶)

پانچواں میں جلانے آیا ہوں

تھے مزارِ غزل پہ چار چراغ

(رطب ویابس، اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، ص،۳۵۱)

۲۔ ادبی و شعری تعارف

ظفر اقبال اردو غزل کے بہت اہم اور رجحان ساز شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ جدت پسندی، منفرد اسلوب اور موضوعات کی ندرت ظفر اقبال کی غزل کا خاصا ہے۔ ظفر اقبال نے اردو شاعری میں باغیانہ روش کو بھی اختیار کیا ہے اور کلاسیکی مزاج کی حامل غزلیں بھی لکھیں۔

کیا بے ہنروں کو میں دکھاتا پھروں، ورنہ

ہے کون سا جلوہ جو نہیں ہے میرے دل میں

(آبِ رواں، اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، ص،۶۸)

بقول محمد اظہار الحق:

"دیو سائی دنیا کا بلند ترین مقام ہے میلوں لمبا اور کوسوں چوڑا، جولائی اور اگست میں یہاں پھول کھلتے ہیں فرسنگ در فرسنگ ہر رنگ کے پھولوں کے قالین بچھ جاتے ہیں۔ اسی میدان میں ندیاں ہیں اور جھیلیں، خوب صورت پرندے ہیں اور لہکتے ہوئے ٹیلے، ہواؤں کے تخت ہیں اور بادلوں کے محل، آسمان پر دریچے ہیں اور فضا میں ان دیکھے دریاؤں کی خوشبو اور ہر طرف دل گیر آہٹیں۔۔۔ بس یہی ظفر اقبال کی شاعری ہے۔"(۷)

نا چیز ہے صد مہر سلیماں مرے نزدیک

بلقیس کے ہونٹوں کا نگیں ہے مرے دل میں

(آبِ رواں، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص،۶۸)

ظفر اقبال نے اینٹی غزل اور لسانی تشکیلات کے تجربات بھی کیے اور زبان کو وسعت بخشنے کے ساتھ ساتھ الفاظ کو نئے مفاہیم سے بھی روشناس کرایا۔ اردو غزل کے جدید تناظر میں ظفر اقبال جیسا عہد ساز شاعر اور کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ بقول افتخار جالب :

> " میر و غالب کے تناظر میں اردو شاعری کا مجموعی اسلوب، فیض کے مکمل لہجے کی تمیز کے بعد جس منفرد توانا اور خود مختار تجرید میں متشکل ہوا ہے، اس کا وہ مقام کہ جس سے نہ صرف ہم عصر تخلیق کا تخمینہ لگایا جا سکے، بلکہ ادبی وراثت اور ورثہ کی قدر و منزلت کا بھی از سر نو تعین کیا جا سکے، ظفر اقبال سے شروع ہوتی، نکلتی، ایک دوسرے کو کاٹتی اور آپس میں در آویزاں لکیروں سے بننے والے گرد و پیش اور رقبہ میں پابند ہیں۔ صاحب عہد کی یہی شناخت ہے۔"(۸)

لگا رہے ہیں نئے ذائقوں کے زخم ابھی
اساس فکر نہ طرز بیاں بناتے ہیں
قریب و دور سے بے جوڑ عکس اشیاء کے
تلاش کرتے ہیں اور داستاں بناتے ہیں
ظفر یہ وقت ہی بتلائے گا کہ آخر ہم
بگاڑتے ہیں زباں یا زُباں بناتے ہیں

(رطب ویابس، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص، ۳۶۰)

افتخار جالب نے ظفر اقبال کو صاحب عہد کہا ہے۔ ظفر اقبال کی قوتِ ایجاد، تخیل کی بلند پروازی اور معنی آفرینی قابلِ دید اور لائق داد ہے۔ انھوں نے اپنے شعری ذوق کو مختلف کرنے میں خاصی ریاضت سے کام لیا ہے۔ روایتی طرزِ ادا اور جدید طرز احساس کا جو امتزاج ظفر اقبال کی شاعری میں پایا جاتا ہے اور کہیں نظر نہیں آتا۔ ان کا شعور ایسے تمام اوصاف سے مزین ہے جو صنف غزل کے عہد بہ عہد ارتقا کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں :

> " ظفر اقبال موجود عہد میں اردو غزل کا ایسا دستخط ہے جس کے بغیر اس عہد کی پہچان ممکن نہیں۔ اردو غزل کے منظر نامے پر ظفر اقبال کے ظہور کو تخلیقی آتش فشاں کے پھٹ پڑنے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جس کی شرر افشانی بعد میں بھی جاری رہی۔"(۹)

توڑ ڈالیں سب حدیں اور مسئلہ حل کردیا
خود بھی سودائی ہوئے، اس کو بھی پاگل کر دیا
ٹوٹ کر الجھی بدن سے وصل کی سرکش ہوا
ایک ہی جھونکے نے کیا جنگل میں منگل کر دیا
تھا، مگر بارِ سفر اتنا نہ تھا پہلے کبھی
اک ذرا سی آرزو نے دل کو بوجھل کر دیا
خاتم الشعرا ہمیں مانیں نہ مانیں وہ ظفرؔ
شاعری کے دین کو ہم نے مکمل کر دیا

(رطب و یابس، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص،۳۱۱)

ظفر اقبال کا تخلیقی وفور اور جوش کہیں تھمتا نظر نہیں آتا۔ اپنی تخلیقی صلاحیت کے لحاظ سے عہد حاضر میں کوئی ان کا ثانی نہیں شاعرانہ قادر الکلامی، اسلوب، تخیل کی پرواز، زبان و بیان پر گرفت، موضوعات کا تنوع اور رنگا رنگی اور انفرادیت ظفر اقبال کو دوسرے غزل گو شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔

ظفر اقبال کی خلاق طبعیت کا اندازہ اس کی پر گوئی سے لگایا جا سکتا ہے اور غزل بھی ایسی کہ جس کا ذائقہ کسی اور شاعر سے نہیں ملتا۔ شمس الرحمان فاروقی اپنے مضمون، طبع رواں منظرِ معنی اور بے شمار امکان میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اس میں کوئی شک نہیں کہ ظفر اقبال کی غزل پڑھ کر ایک نا میاتی جوش، ایک تخلیقی آبشار کا احساس ہوتا ہے۔ اسکی غزل کی سب سے بڑی (یا سب سے نمایاں) خوبی اس کا وفور، اس کی کثرت، اس کی ہما ہمی اور بھرا پرا پن (Plenitude) ہے، جس کے باعث ظفر اقبال کا کلام تخلیقی فطرت کی بے لگام قوت کا احساس دلاتا ہے۔''(۱۰)

چمک اٹھے ہیں جو دل کے کلس، یہاں سے ابھی
گزر ہوا ہے خیالوں کی دیو داسی کا

(آبِ رواں، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص،۸۹)

مدت سے کوئی میرے بھی جیسا نہیں آیا
میں یوں ہی تو منظر پہ دوبارہ نہیں آیا
ہے کیسی مسافت کہ مری راہ میں اکثر
دیوار تو آئی ہے دریچہ نہیں آیا

(عیب وھنر، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص، ۶۷۱)

آگ جنگل میں لگی ہے سات دریاؤں کے پار
اور کوئی شہر میں پھرتا ہے گھبرایا ہوا

(گلاً فتاب، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص، ۲۱۶)

ظفر اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے اور مسلسل مشقِ سخن کرتے ہوئے اردو غزل اس قدر زود گوئی سے لکھی کہ غزل کی تاریخ میں یہ مقدار اپنی جگہ ایک الگ نظیر رکھتی ہے کہ شاید ہی کوئی شاعر اس سے پہلے غزل اس مقدار سے لکھ پایا ہو۔ ظفر اقبال کا تخلیقی وفور کہیں تھمنے کا نام نہیں لیتا۔ ظفر اقبال کی شاعری اردو غزل کے آسمان پر قوسِ قزح کی مانند ہے جس میں مختلف رنگ شامل ہیں۔ ظفر اقبال کی غزل بارش کے بعد وہ دھنک ہے جو روح کو سرشار کرتی ہے اور ذہن و دل کو بالیدگی بخشتی ہے۔

شمیم حنفی اپنے مضمون عجب نہیں کہ ترا چاند ہو ستارہ مجھے، میں لکھتے ہیں کہ:

> "ہمارے ہم عصر غزل گویوں میں صرف دو شاعر ایسے ہیں جن کی غزل ہر طرح کے کلیشیز سے آزاد ہے۔ انکے شعروں کا آہنگ، اُن کا لہجہ، ان کی لفظیات، ان کے تجربے، ان کا طرز احساس، کچھ بھی متعین اور سکہ بند نہیں ہے۔ فکری اور تخلیقی آزادی کا جیسا گھنا اور دیرپا تاثر ظفر اقبال اور احمد مشتاق کی غزل قائم کرتی ہے اسکی مثال کہیں اور نظر نہیں آتی۔"(۱۱)

مری فضا میں ہے ترتیبِ کائنات کچھ اور
عجب نہیں جو ترا چاند ہے ستارہ مجھے

(رطب و یابس، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص، ۳۸۱)

کتنے دیے جلا گئی شام کی تندرو ہوا
پھول گرا کتاب سے، چاند جھڑا نقاب سے

(آبِ رواں، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص، ۱۴۸)

کبھی سیدھا کبھی الٹا نظر آتا ہے مجھے
سب دکھا دیتا ہوں جیسا نظر آتا ہے مجھے
چار سو کوئی بھی منظر نہیں باقی، لیکن
بند آنکھوں سے تماشا نظر آتا ہے مجھے
بیٹھ جاتے ہیں دھول اور دھواں شام کے بعد
رات کے وقت زیادہ نظر آتا ہے مجھے

(وھم و گماں، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص، ۸۴۵)

دل پر کوئی قابو نہ رہا جب تو کسی طور
باندھا ہے یہ وحشی تری زنجیر سے ہم نے

(تشکیک، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص، ۳۱۰۱)

کاغذ کے پھول سر پر سجا کر چلی حیات
نکلی برون شہر تو بارش نے آلیا
ہم بھی شکستِ شوق پہ نالاں رہے، مگر
دل نے تو آسمان ہی سر پر اٹھا لیا۔

(آبِ رواں، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص، ۱۰۶)

ظفر اقبال کا پہلا شعری مجموعہ آبِ رواں جب منظر عام پر آیا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ہر طرف اس کی تحسین و توصیف ہونے لگی اردو شاعری بالخصوص غزل کے قارئین و ناقدین نے اسے واقعتاً آبِ رواں قرار دیا مگر ظفر اقبال کا دوسرا شعری مجموعہ گلاَفتاب جس میں لسانی تشکیلات کے تجربات ہیں اس میں ظفر اقبال نے زبان و بیان کے نئے تجربات کیے اور رائج ضابطے یکسر توڑ

دیے۔لفظوں کے نئے جوڑ توڑ سے روشناس کرایا۔ پنجابی زبان کے پیوند لگائے اور پنجابی، انگریزی، بنگلہ وغیرہ کا درمیانی فاصلہ کم کرنے کی سعی کی اور زبان کو وسعت دیتے ہوئے ان تجربات کو اور گلافتاب کو اردو مستقبل کو دھندلا اور ادھورا خواب نامہ قرار دیا اور ابلاغ کی نئی سطحیں دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ظفر اقبال گلآفتاب کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں کہ :

> ''چھوئی موئی کے بجائے زبان کو زندہ متحرک شے گردانتے ہوئے میں نے اُس کے ساتھ یہ آزادیاں ہیں۔ پنکچو پشن یکسر اڑا دی ہے کہ معانی کو محدود اور پابند کرتی ہے۔ اضافت سے حتی الامکان گریز کیا ہے۔ گرامری گٹھن بھی اب ویسی نہیں رہی۔ اب میں سانس لے سکتا ہوں۔''(۱۲)

میدان تھے جہاں وہاں جنگلے جنگل ہوئے
بے جسم و جاں جڑیں کسی ڈر کے ڈنٹھل ہوئے
جنگل میں جاگنے لگی خشبوئی خواب کی
جھاڑا گلاب تھی گئے کیکر صندل ہوئے

(گلافتاب، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص،۲۴۸)

چمک چکارنے شب شیرنے کے
مزے محکم الف انجیرنے کے
لہو لہلوٹ سیاہی پھیلویں پھب
کڈھب کاغذ طلب تحریرنے کے

(گلافتاب، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص،۲۶۱)

ظفر اقبال کو گلافتاب کی اشاعت کے بعد جہاں افتخار جالب اور شمس الرحمان فاروقی جیسے قد آور نقادوں نے سراہا وہاں ایک گروہ ان کے خلاف بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور انھیں محض کرافت اور تجربات کا شاعر قرار دینے لگا جبکہ ان کے تخلیقی تجربے کو نظرا نداز کر دیا گیا۔ اور یہ کہنے لگے کہ

ظفر اقبال کی جو شعری اُٹھان آبِ رواں میں نظر آتی ہے گلاآفتاب میں تجربات کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اور ایسی آرا کا سلسلہ گلافتاب، رطب و یابس اور ھے ھنومان کی اشاعت پر اور زور پکڑ گیا۔

ساقی فاروقی دنیا نے ایک خط میں لکھا ہے کہ :

''ابھی خوش ہی ہو رہا تھا کہ نگاہ ظفر اقبال کی ایک سے ایک بڑھ کر بوگس غزلوں پر پڑی۔ جی چاہا کہ اوکاڑے جاؤں اور اسے قتل کر دوں۔ اب برداشت نہیں ہوتا۔ اے مالک اسے اٹھالے یا مجھے اُٹھالے۔''(۱۳)

اسی طرح فیصل آباد سے تین شعراء نے تین دن میں ظفر اقبال کے رنگ میں ایک مجموعہ شائع کیا جس کا نام سہ روزہ ھذیان رکھا گیا اور اس کی تقریب رونمائی پر ظفر اقبال کو مدعو کیا گیا۔ اور یوں ظفر اقبال کا تمسخر اڑا گیا۔ مگر ظفر اقبال کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے سے اس رائے کی نفی ہوتی ہے کیونکہ ان کی شاعری کا غالب اسلوب آبِ رواں سے لگا کھاتا ہے۔ ڈاکٹر ضیا الحسن اپنے مضمون ظفر اقبال کے اسلوب کے تشکیلی عناصر، میں لکھتے ہیں کہ :

''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں زیادہ تخلیقی چاؤ نظر آتا ہے۔ وہ آبِ رواں کے بعد ٹھہرے نہیں بلکہ ان کا فن مسلسل ارتقا پذیر رہا ہے، وہ کسی بات، کسی لفظ، کسی تجربے اور کسی اسلوب سے گھبراتے ہیں نہ اس پر قدغنیں لگاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں ہمیں موضوعات اور اسالیب کی ایک پوری کائنات نظر آتی ہے جہاں ادنیٰ انسانی جبلتوں سے لے کر اعلیٰ فکری اظہارات شکل پذیر ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں موضوعاتی اور اسلوبیاتی تنوع اور رنگا رنگی ہے، وہ اسی تنوع اور رنگا رنگی سے وہ بنیادی فضا تخلیق کرتے ہیں۔ جسے ہم ظفر اقبال کی شاعری کہتے ہیں۔''(۱۴)

لفظ پتوں کی طرح اڑنے لگے چاروں طرف
کیا ہوا چلتی رہی آج مرے چاروں طرف
میں نے خود کو جو سمیٹا تو اسی لمحے میں
اور بھی چاروں طرف پھیل گئے چاروں طرف

آپ تو ایک طرف بیٹھ گیا وہ آکر
اور پھر ایک طرف اس نے کیے چاروں طرف
آسماں پر کوئی تصویر بناتا ہوں ظفرؔ
کہ رہے ایک طرف اور ، لگے چاروں طرف

(اطراف ،اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص،۹۴۰)

ظفر اقبال نے اردو غزل کو نئی روایت اور منفرد پیرایہء اظہار سے روشناس کرایا۔ انھوں نے تخلیقی ریاضت اور خون جگر کے عوض خوب داد و تحسین پائی۔ جدید طرز احساس اور تنوع کی بدولت وہ اس عہد کے اہم، صاحب عہد اور بڑے شاعر ٹھہرے اور ان کی شاعری نے سکہ رائج الوقت کی حیثیت حاصل کی۔ مشفق خواجہ لکھتے ہیں کہ :

''جہاں اردو زبان کی چلن ہے اُن کی شاعری کو دنیائے ادب میں سکہ رائج الوقت کی حیثیت حاصل ہے۔ پرانے زمانے میں شاہی سکوں پر شعر لکھے جاتے تھے۔ مگر ظفر اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے شعر ہی کو سکے میں ڈھال دیا۔ پاکستانی سکے کی قیمت آئے دن گرتی رہتی ہے، مگر ظفر اقبال کی ادبی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے سکّوں کی قیمت بڑھتی جارہی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ڈالر کے مقابلے پر ہمارے پاس یہی سکّہ رہ جائے گا۔ اسٹیٹ بنک بھی چھوٹے نوٹوں کی جگہ ظفر اقبال کے شعر جاری کیا کرے گا۔''(۱۵)

آسماں کو کھینچ لایا ہوں زمیں پر، اور ،پھر
اس طرح سے اس زمیں کو آسماں کیسا کیا

(تماشا، اب تک ،کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص،۱۴۶۳)

پڑا ہواہوں اس کے مضافات میں،جدھر دیکھو
سو، میں ہی ہوں، ظفرؔ ،درمیاں کے چاروں طرف

(تماشا، اب تک ،کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص،۱۳۸۶)

ظفر اقبال سر سری مطالعے یا ایک آدھ مجموعے کی قرآت سے کھُلنے والا شاعر ہر گز نہیں ہے اور نہ ہی آسانی سے گرفت میں آتا ہے۔ ظفر اقبال کے شعر کا ذائقہ لینے کیلئے ایک دشوار گزار مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے جو صبر آزما بھی ہے اور پر لطف بھی، خوشگوار بھی روح افزا بھی، ظفر اقبال بدلتے ذائقوں کا شاعر ہے۔ انتظار حسین عیب و ہنر کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ :

''میں جب ظفر اقبال کی غزلیں پڑھ رہا تھا تو بہت دیر تک میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ بالعموم شاعری کے کسی مجموعے کو پڑھتے ہوئے چند غزلوں اور چند نظموں کے ساتھ ہی پتا چل جاتا ہے کہ ہم کس درجہ کی شاعری پڑھ رہے ہیں اور کبھی کبھی تو ایک دانے سے دیگ کا پتا چل جاتا ہے مگر ظفر اقبال کے سلسلے میں دیر تک میں گڑ بڑایا ہوا رہا۔ پھر مجھے میرؔ کے سلسلے میں کسی بزرگ کا یہ مشہور محاکمہ یاد آیا کہ ''بلندش بغایت بلند و پستش بغایت پست'' ابھی میں یہاں تک سوچ پایا تھا کہ اچانک میرے تصور نے پیچھے کی طرف زقند لگائی اور میں اپنے بچپن کے زمانے میں پہنچ گیا۔ بس جیسے رم جھم بارش ہو رہی ہے، ناند میں بھرے پانی میں تر بتر آم رکھے ہیں، میں آم چوس رہا ہوں: ایک کھٹا دوسرا کھٹا، تیسرا کچھ گلا ہوا، چوتھا کچی کیری اور پھر جو میرے ہاتھ میں آتا ہے تو تالو اور زبان کے بیچ رس گھُل جاتا ہے۔ اور اب مجھے ظفر اقبال کی شاعری میں لطف آنے لگا تھا۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ اس شاعر کو کیسے پڑھنا چاہیئے۔ اب میں دوسروں کو بھی یہی کہتا ہوں کہ بھائی اسے ایسے مٹ پڑھیے جیسے اور شاعروں کو پڑھتے ہو۔ ظفر اقبال کی غزلیں ایسے پڑھو جیسے آم کھا رہے ہو۔ ٹیبل پر بیٹھ کر چھری کے ساتھ قلمی آم نہیں، بلکہ جیسے کھٹے میٹھے دیسی آموں سے بھری ناند آپ کے سامنے رکھی ہے اور آپ آستین چڑھا کر اطمینان سے بیٹھے آم چوس رہے ہیں۔''(۱۶)

اس دیگ میں پکا ہے جیسا بھی دال دلیا
ساروں پہ اس کا حق ہے، ساروں میں لا رہا ہوں

(توارد، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص، ۲۱۱۲)

ظفر اقبال تخلیقی تجربات سے ڈرتے نہیں۔ الفاظ سے لے کر موضوعات تک، بہت انفرادیت پائی جاتی ہے۔ الفاظ کے غیر معمولی استعمال اور الفاظ کو الٹ پلٹ کر نئے معانی اخذ کرنے میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ظفر اقبال نے غزل کی زبان، لہجے، مضامین، علائم و استعارات میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ جدید نظم کے اہم شاعر اور نقاد ڈاکٹر سعادت سعید اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں کہ:

> ''میرے خیال میں ظفر اقبال کی غزل میں سلائم اور ابسرڈ کی شکلیں کلیڈوسکوپ میں بننے والی متنوع شکلوں کی مانند ہیں۔ غیر متوقع، انجانی، متحیر کن، بلا اندازہ شکلیں۔ یہ اُن کی قادر الکلامی اور تجربہ وسعتی کے حوالے سے ممکن ہوا ہے۔ ظفر اقبال کو یہ مژدہ مل چکا ہے کہ وقت نے انھیں زبان ساز ٹھہرایا ہے یعنی انھوں نے یقین کی خاک اڑا کر جو گماں بنائے ہیں وہ ہماری عمومی زندگی کے متعدد پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے ان کے امکانی ہیولوں کو بھی گرفت میں لیتے ہیں۔''(۱۷)

کچھ بھرے دریاؤں میں بھی تھی نہ ایسی کیفیت
جو بھنور پیدا ہوئے ہیں اس دلِ پایاب میں

(آبِ رواں، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص، ۱۰۹)

فسوں طرازی میں سو فسانے نکالتا ہوں
میں ایک پل سے کئی زمانے نکالتا ہوں
مرا نیا لفظ باندھنے کا جواز کیا ہے
اگر معانی وہی پرانے نکالتا ہوں

(تفاوت، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص، ۱۲۳۵)

ظفر اقبال نے غزل کے نئے امکانات روشن کیے ہیں اور غزل کی محدود لفظیات کو نئی لفظیات اور نئے تجربات سے آشنا کیا۔ فرسودہ مضامین اور بے جان لفظوں میں نئی تخلیقی روح پھونکی اور قاری کو ایک نئے ذائقے سے روشناس کرایا۔

الفاظ کے نئے استعمال سے اور نئے سیاق و سباق میں رکھ کر معانی کی دنیا آباد کی جس سے غزل کو نئی قوت اور توانائی حاصل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام اپنے اندر ایک بھرپور تازگی اور نیا پن لیے ہوئے ہے۔ ناصر عباس نیر رقمطراز ہیں کہ :

''ظفر اقبال کی شاعری، شاعری کی نئی شعریات وضع کرنے پر اکساتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ جدید اردو غزل کیلئے اس نئی شعریات کی کیا معنویت ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ نئی شعریات کے بغیر ہم ظفر اقبال کی غزل کا مطالعہ کر ہی نہیں سکتے اور یہاں مقصود غزل کا ایسا مطالعہ ہے جو صرف معانی کی سطحوں اور قسموں کو یا اسالیب کے تنوع ہی کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ اسالیب و معانی کے پورے نظام کو گرفت میں لیتا ہے اور ان تمام سوالات کے جوابات مہیا کرتا ہے جو تجربہ پسند اور تنوع شعار متنِ ظفر کے مطالعے سے عموماً پیدا ہوتے ہیں۔۔۔

ظفر اقبال کی شاعری جب نئی شعریات کے لیے اکساتی ہے تو گویا باور کرواتی ہے کہ اُسے خود اس کے داخلی سیاق ہی کی روشنی میں پڑھا جائے''(۱۸)

کاغذ پہ اک باغ بنایا کرتا ہوں
الٹے سیدھے پھول کھلایا کرتا ہوں
جو معلوم نہیں اس کی دیتا ہوں خبر
جو دیکھا ہی نہیں دکھلایا کرتا ہوں

(اطراف، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص،۹۴۶)

تنکا سا کوئی ایک پڑا ایک طرف ہے
اور، سارے زمانے کی ہوا ایک طرف ہے
اطراف ہیں اتنی کہ پتا ہی نہیں چلتا
کچھ بھی نہ سمجھنے کی سزا ایک طرف ہے
میں دیکھتا ہوں، اور، نظر کچھ نہیں آتا
کہنے کو مرا دیکھا ہوا ایک طرف ہے
اس ایک طرف میں ابھی سمتیں ہیں کئی اور

پر سمت کی اپنی ہی جدا ایک طرف ہے
یلغار ہے دنیا کی ظفر،ایک طرف، اور
میں ایک ہوں، اور، میرا کہا ایک طرف ہے

(وھم و گماں، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص،۸۰۹)

ظفر اقبال وسیع امکانات کا شاعر ہے اس نے یکے بعد دیگرے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے اور کر رہا ہے اگر یہ کہا جائے کہ ظفر اقبال نے ہمارے عہد کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے تو یہ بے جا نہ ہو گا۔ ظفر اقبال جدید اردو شاعری کا ایک رجحان ساز شاعر ہے اور اس کے پیروکار اور چاہنے والے بے شمار ہیں۔ سید عامر سہیل نے ظفر اقبال کو کچھ یوں خراج تحسین پیش کیا:

نظم۔۔۔۔۔۔۔۔دیوتا

(ظفر اقبال کے لیے)

بُڑھاپا حُسن پر آیا/ادھر لہجے میں میٹھا پن/کہ جُھریائے ہوئے
سالوں میں آوارہ خرامی کی لپک/کمرے میں یشکے مارتی
ہے/دیوتا ماتھے پر تپتی کہنیاں رکھے/دلائی اوڑھ کر لیٹا ہے/اور
پنکھے کا چلنا/وقت لوری دے رہا ہو جس طرح/ان ثانیوں کو جن
میں/صدیوں کی طہارت ہے/لہو کے سرد ہونے کی حکایت/خواب
گہہ میں ٹانکنی آتی/تو اس کے تخت کو نہج البلاغہ کا بدل لکھتے/کسی
نے وقت کی ابجد کو کاغذ پر/بچھانے کیلئے کتنے جنم کاٹے ابھی اک
حرف کا تعویز انگشتِ شہادت سے/کھلے گا باغ میں چہکار چہکے گی
محبت نے اسے کمرے میں ایسے/سینت کر رکھا ہے جیسے/بخت میں
آسائشوں کی رونمائی کا کوئی/ٹیکا لگا دے/بخت دروازے پہ حاضر
ہو معمہ چیتھڑوں پہ حزن کی کلیاں کھلی ہیں/روندتی ہے بے وفائی
اور یہ صدری، یہ جامہ/جام کی صورت مہجور رقت/خواب میں

نعت کے دروازے کھلیں گے/خوان بچھ جائے گا سپنوں کا/جبیں
پر کاسنی محراب کا غنچہ/عبادت کی گھڑی میں/طائران عجز کا وہ حمدیہ
ہے/عمر نے جس کی ثنا میں/گلستان سینچا تو صبحیں حاضری بھرنے
کو/اس ترتیب سے آئیں غزل کی پائنتی سے/لگ کے یوں بیٹھیں،
حجاب آیا/گلابی پنڈلیوں اور سرخ گالوں کو/وہیں پر کارنس کے
ایک کھونے میں/دھری عینک نے روتی نظم کو پرسہ دیا/تو شام نے
بندِ قبا کھولے/وہ ترچھا ہاتھ جو لکھنے کی بے پایاں مشقت سے
سلونے جسم کو چر کے لگاتا ہے/ابھی بابِ عبادت کو چھوئے گا شام
کی تجسیم کر دے گا/اکہری رات زیور سے لدی/پیروں میں بچھ
جائے گی/وہ لفظوں کی کھڑکی کھول دے گا/عشق سینے سے طلوع
ہونے کی/ساعت آگئی ہے/اک غزل ہو گی/غزل نے جتنے دکھ
سکھ اس اکیلی جان سے/اب تک کیے ہیں/ساعت سیار نے وہ
دوسرا سینہ نہیں دیکھا/غزل جس سے کھلی ہو/اس قدر جس کے
گلے/لگ لگ کے روئی ہو/کہ سارے عہد کے فن پارے/جھوٹے
پڑ گئے ہیں مبارک ہے وہ سینہ جس کی/تختی پر غزل کی آیتیں
اتریں وہ سادہ روشنائی/اس کی پوروں نے چھوا جس کو/وہ برتن
جس میں اس کا رزق رکھا ہے/وہ چپل جس نے بوڑھے ماس
کی/پھٹتی لکیروں کو سدا بوسے دیے ہیں/اور وہ کمرہ جہاں اس
کی کتابیں/اور اس کے جسم کا جزدان رکھا ہے/مبارک ہے وہ
قالب/جس میں اس کی روح کا/قرآن رکھا ہے"[19]

(سید عامر سہیل)

عامر سہیل نے نہ صرف ظفر اقبال کے لیے شاعری میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا بلکہ ادریس بابر اور عامر سہیل دو ایسے شاعر نظر آتے ہیں جنھوں نے ظفر اقبال کے تجربات کو اپنانے میں اولیت

دکھائی۔ اس کا ثبوت صاحبِ نظم کی اولین کتاب لبادہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے ظفر اقبال کے رنگ میں نہ صرف شاعری کی بلکہ افعال بنانے کے سلیقے میں بھی گلافتاب کے تجربات کو اپنایا۔

حوالہ جات

۱۔ کاشف مجید ''ظفر اقبال کے ساتھ مکالمہ''مشمولہ: انگارے کتابی سلسلہ نمبر۴۸، دسمبر ۲۰۰۶، مرتبہ: سید عامر سہیل، گل گشت کالونی، ملتان، ص ۵

۲۔ سید عامر سہیل ''چند لمحے ظفر اقبال کے ساتھ'' مشمولہ: انگارے کتابی سلسلہ نمبر۴۸، دسمبر ۲۰۰۶ء، مرتبہ: سید عامر سہیل، گل گشت کالونی، ملتان، س ۳۸

۳۔ ظفر اقبال، اب تک(کلیاتِ غزل) جلد پنجم، رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۴۰۸۸

۴۔ کاشف مجید ''ظفر اقبال کے ساتھ مکالمہ''مشمولہ: انگارے کتابی سلسلہ نمبر۴۸، دسمبر ۲۰۰۶، مرتبہ: سید عامر سہیل، گل گشت کالونی، ملتان، ص ۶

۵۔ شاعر علی شاعر ''عرضِ ناشر'' مشمولہ: اب تک (کلیاتِ غزل) ظفر اقبال، جلد پنجم، رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۶ء، س ۳۱۹۷

۶۔ عابد سیال، ڈاکٹر ''ظفر اقبال کو پڑھتے ہوئے'' مشمولہ: اب تک (کلیاتِ غزل) ظفر اقبال، جلد پنجم، رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۳۹۴۷

۷۔ محمد اظہار الحق، ''کالم''مشمولہ: اب تک (کلیات غزل)، ظفر اقبال، جلد سوم، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص: ۲۳۳۸

۸۔ افتخار جالب، مشمولہ: گلافتاب، مشمولہ: اب تک (کلیات غزل)، ظفر اقبال، جلد اوّل، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۴ ص: ۱۵۹

۹۔ گوپی چند نارنگ ''فلیپ''مشمولہ: اب تک(کلیاتِ غزل)، ظفر اقبال، جلد سوم، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۶ء

۱۰۔ شمس الرحمن فاروقی ''طبع رواں، منظرِ معنی اور بے شمار امکان''مشمولہ: اب تک (کلیاتِ غزل)، ظفر اقبال، جلد اول، ملٹی میڈیا افئرز، لاہور ۲۰۰۴ ، ص: ۴۱

۱۱۔ شمیم حنفی ''ظفر اقبال: عجب نہیں کہ تیرا چاند ہو ستارہ مجھے''مشمولہ:انگارے کتابی سلسلہ نمبر۴۸، دسمبر۲۰۰۶ء، مرتبہ: سید عامر سہیل، گل گشت کالونی ملتان، ص:۵۵

۱۲ ظفر اقبال، گلآفتاب، مشمولہ:اب تک (کلیاتِ غزل)، جلد اول، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور۲۰۰۴، ص:۲۸۵

۱۳۔ ساقی فاروقی''خط''مشمولہ: دنیا زاد ترتیب، آصف فرخی،شمارہ ۱۹، شہرزاد،کراچی، ص:۳۵

۱۴۔ ضیا الحسن،ڈاکٹر،''ظفر اقبال کے اسلوب کے تشکیلی عناصر''مشمولہ :انگارے کتابی سلسلہ نمبر۴۸، دسمبر۲۰۰۶ء، مرتبہ: سید عامر سہیل، گل گشت کالونی، ملتان، ص ۷۲

۱۵۔ مشفق خواجہ،''مزاحیہ کسرِ نفسی''مشمولہ: اب تک(کلیاتِ غزل) ظفر اقبال، جلد دوم، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص:۷۸۹

۱۶۔ انتظار حسین،''پیش لفظ''عیب وھنر، مشمولہ:اب تک(کلیاتِ غزل) ظفر اقبال، جلد دوم، ملٹی میڈیا افیئرز لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۶۰۹

۱۷۔ ایم فیاض خالد ''سعادت سعید سے ایک انٹرویو۔ ظفر اقبال کے حوالے سے'' مشمولہ: انگارے کتابی سلسلہ نمبر۴۸، دسمبر ۲۰۰۶ء، مرتبہ: سید عامر سہیل، گل گشت کالونی، ملتان، ص ۳۲

۱۸۔ ناصر عباس نیر ، ڈاکٹر''شعریاتِ ظفر: چند باتیں'' مشمولہ: نزول شمارہ نمبر۸،دسمبر ۲۰۱۳ء،ادارت: سید اذلان شاہ، گوجرہ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ، ص:۱۲۷

۱۹۔ عامر سہیل''دیوتا(نظم) ظفر اقبال کے لیے ''مشمولہ:نزول شمارہ نمبر۸،دسمبر ۲۰۱۳ء، ادارت: سید اذلان شاہ، گوجرہ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ، ص:۱۷۱

باب دوم

استعارہ: نظری مباحث: اہلِ بلاغت اور اہلِ نقد کی نظر میں

ا۔ استعارہ: اہلِ بلاغت کی نظر میں:

علم بیان۔۔۔ لغوی واصطلاحی مفہوم۔۔۔۔۔۔۔ اقسام۔۔۔۔۔۔۔ آرا و تعاریف۔۔۔۔۔۔ علمائے بلاغت کا اختلاف۔۔۔۔۔۔۔ حاصلِ بحث۔۔۔۔۔۔۔ ارکانِ استعارہ۔۔۔۔۔ اقسامِ استعارہ۔۔۔۔۔۔ استعارہ و کذب۔۔۔۔۔۔ تشبیہ اور استعارہ میں فرق۔۔۔۔۔۔۔ علامت اور استعارے میں فرق۔۔۔۔۔۔۔

۲۔ مغربی تنقید میں استعارے کے مباحث:

مغربی ناقدین ارسطو۔۔۔۔۔ افلاطون۔۔۔ سسرو۔۔۔ ہورلیس۔۔۔۔ لانجائنیس۔۔۔۔۔ دانتے۔۔۔ شیلے۔۔۔ ہرڈر۔۔۔ ویکو۔۔۔۔ ورڈزورتھ۔۔۔۔ کولرج۔ ۔۔۔ فلپ۔۔۔۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ۔۔۔۔

3۔ اردو تنقید میں استعارے کے مباحث:

شبلی۔۔۔۔ حالیؔ۔۔۔۔ محمد حسن عسکری۔۔۔ انتظار حسین ۔۔۔۔۔۔ ممتاز حسین۔۔۔ گوپی چند نارنگ۔۔۔۔ ہادی حسین۔۔۔ ناصر عباس نیر۔۔۔۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔۔۔ معید رشیدی۔۔۔۔ ڈاکٹر عابد سیال۔

استعارہ: نظری مباحث: اہلِ بلاغت کی نظر میں

استعارہ علم بیان کی چار شاخوں تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل، کنایہ میں سے ایک اہم شاخ ہے۔ اس لیے استعارہ کے مباحث سے قبل علم بیان کی مختصر وضاحت ضروری ہے تا کہ استعارہ کی وضاحت اور مباحث میں کسی قسم کا سقم اور تشنگی باقی نہ رہے۔

علم بیان:

بیان عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ظاہر کرنا، واضح کرنا، روشن کرنا کے ہیں۔ فرہنگ آنند راج کے مطابق ''پیدا و ظاہر'' یا ''واضح آشکار'' کے ہیں[1] یعنی کسی بات کی شرح و وضاحت اس انداز سے کرنا کہ مخاطب کو بات کی جزئیات سمیت آگہی حاصل ہو جائے۔ فصاحت و علم بیان کی دو اہم خصوصیات ہیں۔ یہ علم کلام میں معنوی خوبیاں پیدا کرتا ہے اور اسے دلنشین بناتا ہے۔ کلام میں زور اور اثر پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ متنوع پیرایہ بیان کے استعمال کا نام علم بیان ہے۔ ابلاغ اور ترسیل کے ساتھ جدت، ندرت اور اثر پیدا کرنے میں ممد و معاون ہے۔ علم بیان کلام کو سمجھنے میں غلطی کے امکانات کو ممکنہ حد تک کم کرتے ہوئے معانی میں خوبصورتی پیدا کرتا ہے۔

بقول ڈاکٹر مزمل حسین:

> '' یہ علم ایسے اصول و قواعد کا مجموعہ ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک معنی کو کئی طریقوں سے بیان کرنے کا کیا کیا انداز اور سلیقہ ہے یعنی شاعر یا نثر نگار اپنے مقصد کو بیان کرنے کیلئے مختلف راہوں کو اختیار کر سکتا ہے''۔[2]

بقول میر انیسؔ:

گلدستہء معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

علمِ معانی میں الفاظ کو ان کے حقیقی معانی میں استعمال کیا جاتا ہے جبکہ علم بیان میں الفاظ کو حقیقی و مجازی یا غیر حقیقی معانی میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور لغت سے استناد کی چنداں ضرورت

نہیں ہوتی جبکہ استعمال کا جواز اور قرینہ ضرور موجود ہوتا ہے۔ سید عابد علی عابد علم بیان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

"علم بیان وہ علم ہے جو مجاز [(۱) تشبیہ (۲) استعارہ (۳) مجاز مرسل (۴) کنایہ] سے اس طرح بحث کرتا ہے کہ اس پر حاوی ہونے کے بعد فنکار، انشا پرداز یا خطیب اپنے مفہوم کے ابلاغِ تام میں کامیاب ہو سکے"(۳)

جبکہ مولوی نجم الغنی علم بیان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

"علم بیان ایسے قاعدوں کا نام ہے کہ اگر کوئی ان کو جانے اور یاد رکھے تو ایک معانی کو کئی طریق سے ادا کر سکتا ہے جن میں بعض طریق کی دلالت معنی پر بعض طریق سے زیادہ واضح ہوتی ہے۔"(۴)

ان تعریفات کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیان در حقیقت مجاز ہے اور تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل، اور کنایہ اس کے ارکان ہیں اور اس فن کے ذریعے شاعر، انشا پرداز ان کو کام میں لا کر خیالات وافکار کے ابلاغ اور ترسیل میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل، کنایہ، علم بیان کے وہ مختلف پرائے ہیں جو کسی بھی سادہ بیان کو پر اثر اور دلکش بناتے ہیں۔ مندرجہ بالا بحث سے یہ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں کہ علم بیان در حقیقت مجاز ہے اور اس کے مختلف ارکان میں بھی الفاظ مجازی مفہوم میں ہی مستعمل ہیں۔ بقول ظفر اقبال:

راستی ہے اگر تو اتنی سی
ہر حقیقت مجاز ہے مجھ میں

(تخفیف، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص: ۲۷۶۰)

ظفر اقبال غزل میں اپنے شعری تجربے کو بیان کرتے ہوئے اپنا شعری رویہ اور اظہار کا قرینہ جس طرح مندرجہ بالا شعر میں بیان کرتے ہیں وہ ہماری توجہ اس حقیقت کی جانب مبذول کرواتا ہے کہ ان کا رجحان عموماً مجاز کی طرف رہا ہے جس کے لیے انھیں فی الحقیقت علم بیان کی طرف رجوع کرنا پڑا اور یوں لفظوں کے حقیقی اور مجازی معانی میں پایا جانے والا بعد ان کے کلام کی نمایاں خوبی بن کے سامنے آتا ہے۔

علم بیان کے مباحث کے بعد اب ہم براہِ راست استعارہ کی طرف آتے ہیں۔

استعارہ:

استعارہ عربی زبان کا لفظ ہے۔استعارہ کے لغوی معنی، مانگنا،[۵] عارضی طور پر کوئی چیز لینا،[۶] مستعار لینا،[۷] کے ہیں۔

علم بیان کی اصطلاح میں ایک شے کو ہُو بہو دوسری شے قرار دے دیا جائے اور اس دوسری شے کے لوازمات پہلی شے سے منسوب کر دیے جائیں اسے استعارہ کہتے ہیں۔ بقول سجاد مرزا بیگ:

> ''استعارے کے لغوی معنی تو عاریتاً طلب کرنا ہے۔اصطلاح میں وہ لفظ جو غیر وضعی معنوں میں استعمال ہوا ہو اور حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا علاقہ ہو۔ نیز مشبہ یا مشبہ بہ کو حذف کر کے ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں لیکن کوئی ایسا قرینہ بھی ساتھ ہی ظاہر کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے کہ متکلم کی مراد حقیقی معنوں کی نہیں ہے۔ معنی مشبہ کو مستعار لہ (مانگا ہوا اس کے واسطے) معنی مشبہ بہ کو مستعار منہ، (مانگا ہوا اس سے) اس لفظ کو جو مشبہ بہ کے معنی پر دلالت کرے مستعار، وجہ شبہ کو وجہ جامع کہتے ہیں۔ یہ خیال رہے کہ جب مشبہ کو حذف کر کے مشبہ بہ کو ذکر کرتے ہیں تو متکلم کا مقصد یہ ہو جاتا ہے گویا مشبہ بہ عین ہے اور اس لحاظ سے بعض علما استعارہ کو مجاز عقلی کہتے ہیں۔یعنی جو چیز واقعی نہ ہو، اس کو واقعی فرض کر لینا عقل کا کام ہے لیکن دراصل استعارے میں یہ دعویٰ کہ مشبہ عین مشبہ بہ ہے بطورِ مبالغہ ہوتا ہے نہ بطورِ حقیقت۔۔۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ استعارہ مجازِ لغوی ہے۔''[۸]

گویا سجاد مرزا بیگ کے مطابق استعارہ مجاز عقلی اور مجاز لغوی ہے۔

نجم الغنی مولوی کے بقول:

> ''استعارے میں مشبہ کو بعینہ مشبہ بہ ٹھہرا لیتے ہیں۔یعنی بہادر کو بعینہ شیر سمجھ لیتے ہیں۔ مشبہ خواہ مذکور ہو جیسے استعارہ بالتصریح میں؛ مثلاً شیر کہیں اور اس سے بہادر مراد ہو، خواہ مشبہ بہ متروک ہو اور مشبہ مذکور ہو۔ وہ شے کہ مشبہ بہ سے خصوصیت رکھتی ہو، اس کو مشبہ کے واسطے ثابت کریں جیسے استعارہ بالکنایہ میں جس کا دوسرا نام استعارہ مکنیہ بھی ہے۔''[۹]

بقول میر تقی میرؔ:

تھا مستعار حُسن سے اُس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی تیرا ہی ذرہ ظہور تھا

ظفر اقبال کے بقول:

تھے اشارے اور کنائے سے پس الفاظ کچھ
شورو شر میں ایک ایسا بے زباں پیغام تھا

(تشکیک،اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص:۳۰۸۹)

میر سے ظفر اقبال تک کے شعرا جب اپنے شعری تجربے کو بیان کرتے ہوئے واضح انداز میں بلیغ اشارے دیتے ہیں تو محقق اور قاری کے لیے علمِ بیان، بدیع، معانی اور عروض پر اپنی دسترس کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ قاری اور ناقد سے بھی اس بات کے متقاضی نظر آتے ہیں کہ وہ ان کی شاعری کو حقیقی و مجازی معانی میں بھی دیکھے اور ان کے فن کی داد دیتے ہوئے ان علوم کی شاخوں سے بھی رجوع کرے۔

ممتاز حسین استعارے کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں:

> ''استعارہ جیسا کہ علم بیان میں بتایا گیا ہے مجاز کی ایک قسم ہے۔استعارہ ہمیشہ مجازی معنی میں استعمال ہوتا ہے نہ کہ حقیقی یا لغوی معنی میں اور مجاز کے معنی ہیں تجاوز کرنا۔اس کے یہ معنی ہوئے کہ جب کوئی ذہنی تصویر لغوی معنی سے تجاوز کرتی ہے تو اس کو استعارہ کہتے ہیں۔انگریزی زبان میں استعارے کیلئے جو لفظ (Metaphor) استعمال ہوتا ہے تو اس لفظ کا مفہوم بھی یونانی زبان میں تقریباً وہی ہے جو مجاز کا ہے یعنی آگے بڑھانا''(۱۰)

استعارہ میں کسی لفظ کو غیر وضعی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور حقیقی اور مجازی (مرادی) معنوں میں تشبیہ کا تعلق پایا جاتا ہے مثلاً ککڑی بیچنے والا کہتا ہے کہ ''لیلیٰ کی انگلیاں ہیں'' یا'' مجنوں کی پسلیاں'' ہیں۔ یعنی اُس نے پتلی پتلی ککڑیاں سجا رکھی ہیں جنہیں وہ لیلیٰ کی انگلیوں اور مجنوں کی پسلیوں سے تشبیہ دیتا ہے جبکہ اس کے الفاظ لیلیٰ کی انگلیاں، مجنوں کی پسلیاں حقیقی معنوں میں استعمال

نہیں ہوئے بلکہ مجازی معنوں میں مذکور ہوئے ہیں اور حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا علاقہ ہے مندرجہ بالا بحث سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ استعارے سے مراد۔۔۔۔(i) الفاظ کا مجازی معنوں میں استعمال ہونا، یعنی لفظ اپنے وضعی معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔(ii) اس کے ذریعے بالکل مختلف اور متضاد چیزوں یا خیالات کے درمیان ایک ربط اور تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔

استعارے کے ذریعے حقیقت کو بیان کرنے کے مجازی ذرائع سے رجوع کیا جاتا ہے جو لفظ کے معانی کی تحدید کو ختم کر کے اسے وسعت سے ہمکنار کرتا ہے۔ حقیقی و مجازی معنی میں پایا جانے والا تعلق اس کی گرہ کشائی کرتا ہے۔ بقول ظفر اقبال:

استعارہ اصل سے ہونے نہ پائے گا الگ
اس طرح سے پھول پر اس نے سجایا پھول ہے

(تجاوز، اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، ص:۱۹۷۸)

استعارہ فکر و تخیل کی اصل تک رسائی اور جہان معنی کے براہِ راست انکشاف کا بہترین ذریعہ ہے۔ بعض خیالات اتنے باریک یا اتنے دقیق ہوتے ہیں کہ جب تک کسی مخصوص چیز سے تشبیہ دے کر ان کی وضاحت نہ کر لی جائے سننے والے کے ذہن میں کوئی روشن تصویر نہیں ابھرتی لہٰذا استعارہ محض کلام کا زیور نہیں بلکہ در حقیقت شاعر کے مفہوم کی وضاحت کرتا ہے بقول اکبر الہ آبادی:

"اگرچہ لفظوں کی بدلیوں میں چھپا ہے معنی کا چاند اکبرؔ
مگر معانی ہیں ایسے گلشن کہ نُور کی طرح چھن رہے ہیں

ارکان استعارہ:

علمائے علم بیان نے ارکانِ استعارہ کی تعداد تین بتائی ہے۔

(i) مستعار لہٗ (ii) مستعار منہٗ (iii) وجہ جامع

(i) مستعار لہٗ

وہ شخص، شے یا معروض جس کیلئے کوئی لفظ یا صفت مستعار یا ادھار لی جائے۔ یہ عام طور پر شعر یا جملوں میں مذکور نہیں ہوتا۔ قیاس اور احساس سے اندازہ ہو جاتا ہے

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے

(مرزا سلامت علی دبیر)

اس شعر میں حضرت عباسؑ کے لیے شیر کا لفظ اور صفت مستعار لی گئی۔

(ii) مستعار منہٗ

وہ شخص یا چیز جس سے کوئی لفظ یا صفت ادھار لی جائے، مستعار منہ کہلاتا ہے۔ ان دونوں ارکان کو ایک ارکانِ استعارہ یا طرفین استعارہ بھیکہا جاتا ہے۔ مندرجہ بالا شعر میں شیر مستعار منہ ہے۔

(iii) وجہ جامع

وہ مشترک صفت جس کی بناپر استعارہ کیا جائے۔

ارکانِ استعارہ کی چند مثالیں دیکھیں۔

(i) اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی	نیک مرد	اللہ کے شیر	بہادر
(ii) اک روشن دماغ تھا نہ رہا۔	عالم آدمی	روشن دماغ	بصیرت

میر تقی میر نے کہا تھا:

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

اس شعر میں مستعارلہ محبوب ہے اور مستعارمنہ گل ہے اور وجہ جامع خوبصورتی ہے مستعارلہ اور مستعارمنہ میں جو صفت اور خوبی مشترک ہو اسے وجہ جامع کہتے ہیں۔ یعنی تشبیہ میں جو چیز مشبہ ہے۔ استعارہ میں مستعارلہ ہے۔ مشبہ بہ یہاں مستعارمنہ ہے اور وجہ شبہ استعارہ میں آکر وجہ جامع کہلاتی ہے۔ مندرجہ بالا شعر میں بہادری وجہ جامع ہے۔

اقسام استعارہ:

علمائے علم بیان نے استعارے کی مختلف اقسام درج کی ہیں مثلاً۔ استعارہ بالتصریح یا استعارہ تصریحیہ، استعارہ بالکنایہ، استعارہ متخیلہ (یا تخیلیہ) استعارہ مطلقہ، استعارہ مجردہ، استعارہ مرشحہ، استعارہ تحقیقیہ، استعارہ وفاقیہ، استعارہ عنادیہ جبکہ ممتاز حسین نے اپنی کتاب ادب اور شعور میں اس استعارے کی ایک اور قسم ''انقلابی استعارہ'' درج کی ہے۔ استعارہ بالتصریح اور استعارہ بالکنایہ کو سید عابد علی عابد نے اپنی کتاب البیان میں بنیادی اقسام بتایا ہے۔

۱۔ استعارہ بالتصریح:

استعارہ بالتصریح میں مستعارمنہ مذکور اور مستعارلہ غیر مذکور ہوتا ہے۔ قرینہ اس بات پر قائم ہوتا ہے کہ الفاظ کو لغوی معانی میں استعمال نہیں کیا گیا۔ مثلاً

آفتاب روزِ مشتاقاں ہو یا رب جلوہ گر
شام تنہائی بسر ہوتی ہے کیو نکر دیکھیئے

اس شعر میں آفتاب مستعارمنہ ہے جو مذکور ہے اور اس سے مراد محبوب ہے جو مستعارلہ ہے اور غیر مذکور ہے۔

۲۔ استعارہ بالکنایہ

وہ استعارہ ہے جس میں مستعارمنہ مذکور نہ ہو لیکن مستعارمنہ کے مناسبات ولوازمات کا ذکر کیا جائے مثلاً

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سوخموش ہے

یہاں شاعر نے کسی تشبیہ سے کام نہیں لیا وہ یہ نہیں کہتا کہ میرے دل میں جوشِ غم اس طرح ہے جسے یہ ہو، جیسے وہ ہو بلکہ اس کے برعکس وہ براہِ راست ایسی تصویر پیش کرتا ہے جو اس کے غم سے معنوی اتحاد رکھتی ہے چنانچہ وہ مستعار لہ کے اوصاف کا ذکر نہیں کرتا بلکہ صرف مستعار منہ کے اوصاف کا ذکر کرتا ہے۔

۳۔ استعارہ متخیلہ یا تخیلیہ

استعارہ متخیلہ میں مشبہ بہ کے خاص لوازم کو مشبہ کیلئے ثابت کیا جاتا ہے۔ مثلاً

میلے کرتے ہو عبث عطر لگا کر گیسو
اپنی بو باس سے ہیں آپ معطر گیسو

اس شعر میں گیسو کو عطر سے تشبیہ دی گئی ہے اور بو باس جو عطر کے لوازم میں سے ہے۔

۴۔ استعارہ مطلقہ

وہ استعارہ ہے جس میں مستعار لہ اور مستعار منہ میں سے کسی کے مناسبات مذکور نہ ہوں مثلاً

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

اس شعر میں مردِ مخصوص کا استعارہ چراغ سے کیا مردِ مخصوص مستعار لہ اور چراغ مستعار منہ ہے دونوں میں سے کسی کے لوازمات یا صفات مذکور نہیں۔

۵۔ استعارہ مجردہ

اس استعارہ کو کہتے ہیں جس میں مستعار لہ کے مناسبات وصفات کا ذکر ہو مثلاً

بھیجنا خط کا کیا اُس بت نے بند
اب خدایا موت کا پیغام بھیج

اس شعر میں بت معشوق کیلئے استعمال ہوا ہے معشوق مستعارلہ اور بت مستعارمنہ ہے مستعارلہ یعنی معشوق کی مناسبت سے خط کا نہ بھیجنا مذکور ہوا ہے۔

۶۔ استعارہ مرشحہ

اب استعارہ جس میں مستعارمنہ کی صفات و مناسبات کا ذکر ہو مثلاً

ہے تنفر مجھ سے، ربط اس گل کو ہے اغیار سے
سوکھ کر کانٹا ہواہوں بلبلو اس خار سے

اس شعر میں معشوق مستعارلہ اور گل مستعارمنہ ہے گل کی رعایت سے بلبل اور خار کا ذکر کیا گیا ہے۔

۷۔ استعارہ تحقیقیہ

اس استعارہ سے مراد یہ ہے جو معنی مراد ہوں وہ بطور تحقیق ہوں نہ کہ بطریق تخیل۔ خواہ حسی ہوں یا عقلی۔

ساقی قدح شراب دے دے
مہتاب میں آفتاب دے دے
آفتاب سے مراد شراب ہے

۸۔ استعارہ وفاقیہ

اس استعارہ کو کہا جاتا ہے جس میں مستعارلہ اور مستعارمنہ دونوں ایک شے، جگہ یا شخص میں جمع ہو سکیں اور یہ امر بعید از قیاس نہ ہو۔

مثلاً

گرے مثل پروانہ ہر روشنی ہر
گرہ میں لیا باندھ حکم پیمبر

اس شعر میں حالی کہتے ہیں کہ اہل عرب نے اسلام لانے کے بعد آنحضرت ﷺ کی علم و حکمت کی ہر بات کو گرہ میں باندھ لیا یہاں روشنی مستعار منہ ہے اور مستعار لہ علم و حکمت ہے۔ اور روشنی اور علم و حکمت دونوں کا اجتماع فردِ واحد میں ممکن ہے بعید از قیاس نہیں۔

۹۔ استعارہ عنادیہ

اس استعارہ کو کہا جاتا ہے جس میں مستعار لہ اور مستعار منہ کا ایک شے، جگہ یا شخص میں جمع ہونا محال اور بعید از قیاس ہو مثلاً

نہ گفتار میں ان کے کوئی خطا ہے
نہ کردار ان کا کوئی ناسزا ہے

اس شعر میں حالی کہتے ہیں کہ دور حاضر کے مسلمان اپنے آباؤ اجداد کے برعکس واقع ہوئے ہیں ان کی گفتار خطا پر مبنی ہے اور ان کا کردار ان کے سزاوار نہیں بلکہ مطلقاً۔ ناسزا ہے۔ پس خطا ہونے کا استعارہ خطا نہ ہونے سے اور ناسزا ہونے کا استعارہ سزاوار ہونے سے کیا ہے اور ظاہر ہے کہ ایک شخص میں خطا ہونا اور اس کا عدم بیک وقت مجتمع نہیں ہو سکتے اور اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص بیک وقت سزا اور ناسزا کردار رکھتا ہو۔

۱۰۔ استعارہ انقلابی

استعارہ انقلابی کا ذکر کرتے ہوئے ممتاز حسین کہتے ہیں کہ :

> ''علمِ بیان کی کتابوں میں استعارے کی مختلف قسمیں درج ہیں جن میں استعارہ بالتصریح، استعارہ بالکنایہ، استعارہ مطلقہ، استعارہ اصلیہ حتی کہ استعارہ تخییلیہ (ایں چہ بوالعجبی است) تک درج ہے لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ان میں ایک استعارے کا ذکر نہیں جو ان سب پر بھاری ہے۔ اس کو استعارہ انقلابی کہتے ہیں۔ جو استعارے کے تمام حدود کو توڑ کر اس طرح نمودار ہوتا ہے کہ علم بیان والے منہ

تکتے رہ جاتے ہیں۔ بڑا شاعر اپنے انقلابی استعاروں سے پہچانا جاتا ہے۔ میرؔ کا شعر ہے۔

کہاں آتے میسر تجھ سے مجھ کو خود نما اتنے
یہ حسنِ اتفاق آئینہ تیرے رو برو ٹوٹا

یہ وہ انقلابی استعارہ ہے جو علم بیان کے معلموں کی تعریفوں سے آزاد ہے یہ استعارہ میرؔ نے اردو میں فارسی زبان سے داخل کیا لیکن اس کا استعمال ایسا کیا گیا ہے کہ اس کا اپنا بن گیا ہے۔ اس کی معنویت لا محدود وسعت خیال کی حامل ہے یہ اپنی ذات سے ایک کتاب ہے۔ اس میں انسان کی اپنی خود نمائی پر ہی زور نہیں ہے بلکہ اس کی کبریائی پر بھی زور ہے۔"(۱۱)

۱۱۔ استعارہ خاصیہ

وہ استعارہ جس میں وجہ جامع غیر واضح ہو جسے لوگ آسانی سے نہ سمجھ سکیں۔

۱۲۔ استعارہ عامیہ

وہ استعارہ جس میں وجہ جامع بہت واضح ہو، اسے مبتذلہ بھی کہتے ہیں۔

استعارہ اور کذب

استعارے میں چونکہ مشبہ اور مشبہ بہ کو اتحاد معنوی اور مماثلت باطنی کی بنا پر ایک ہی چیز سمجھ لیا جاتا ہے لہذا اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ استعارے اور کذب میں کیا فرق ہے اس سوال کا اصولی اور منطقی جواب یہ ہے کہ استعارے میں ایک حقیقت بطور مبالغہ بیان کی جاتی ہے اور فنکار اس بات کا قرینہ ہمیشہ قائم رکھتا ہے کہ وہ الفاظ کو ان کے اصل نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال کر رہا ہے اور کبھی یہ گمان نہیں ہوتا کہ شاعر جھوٹ بول کر قاری کو گمراہ کر رہا ہے۔

تشبیہ اور استعارہ میں فرق

(۱) تشبیہ علم بیان کی ابتدائی شکل ہے جبکہ استعارہ ترقی یافتہ شکل ہے۔ استعارہ میں تشبیہ کی نسبت زیادہ بلاغت پائی جاتی ہے۔

(۲) تشبیہ میں کسی چیز کو دوسری چیز کے مانند قرار دیا جاتا ہے جبکہ استعارہ میں ایک چیز کو بعینہ دوسری چیز قرار دیا جاتا ہے۔

(۳) تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کا ذکر ہوتا ہے جبکہ استعارہ میں پہلے فریق کا ذکر نہیں ہوتا۔

(۴) تشبیہ میں حروف تشبیہ استعمال ہوتے ہیں جبکہ استعارہ میں نہیں ہوتے

(۵) تشبیہ کے ارکان کی تعداد پانچ ہے جبکہ استعارہ کے تین ارکان ہیں۔

(۶) استعارہ تشبیہ سے زیادہ قوی ہوتا ہے کیونکہ تشبیہ میں دو چیزوں کا مشابہ ہونا ظاہر کیا جاتا ہے جبکہ استعارہ میں دونوں کا یکجا ہونا ظاہر کیا جاتا ہے

(۷) تشبیہ لغت کے تابع ہوتی ہے جبکہ استعارے کا لغت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ اسے ایجاد کیا جاتا ہے۔

(۸) تشبیہ حقیقی ہوتی ہے جبکہ استعارہ مجازی ہوتا ہے کیونکہ استعارہ کی بنیاد خیال پر ہوتی ہے۔

علامت اور استعارے میں فرق:

استعارے کی طرح علامت میں بھی مجازی مفہوم مراد ہوتا ہے مثلاً۔ معاشرتی بد حالی اور انتشار یا سیاسی عدم استحکام کیلئے رات کی علامت کا استعمال ہوتا ہے۔ لہذ ہ ان مماثلتوں کی بنیاد پر بعض اوقات استعارے اور علامت میں فرق مشکل. ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت حسین سبزواری رقمطراز ہیں کہ:

> ''اشعار اور اشارہ کثرت کے ساتھ ادبی تنقید میں استعمال ہونے والے الفاظ ہیں ۔استعارہ قدیم اصطلاح ہے۔ عربی، فارسی اور اردو کے کلاسیکی ادب میں اس کی شرح کر دی گئی ہے۔ اشارہ البتہ نئی اصطلاح ہے۔ یہ انگریزی لفظ (symbol) کا ترجمہ ہے۔ علامت، رمز، ایما اس کے مترادفات ہیں۔ اردو کے تنقیدی ادب میں جس طرح یہ دو اصطلاحیں استعمال ہو رہی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام لکھنے والوں کے ذھن میں ان کا کوئی واضح اور معین مفہوم نہیں استعارے اور اشارے

میں عام طور سے کوئی فرق بھی نہیں کیا جاتا اور ان کو غلط ملط کر کے گمراہ کن نتیجے نکال لیے جاتے ہیں۔"(۱۲)

علم بیان میں استعارہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اس کے اصول مرتب ہیں استعارے کا منصب اور غایت واضح ہے لیکن مغرب کی جدید تحریکوں کے ساتھ ہمارے ہاں شعری علائم و رموز کا ایک سلسلہ بھی در آیا جس کے اصول قطعیت سے مرتب نہ کیے جا سکے ضرورت اس امر کی ہے کہ علامت اور استعارے کے دائرے علیحدہ علیحدہ متعین کر دے جائیں تا کہ استعارے پر علامت اور علامت پر استعارے کا شک نہ ہو۔

(۱) اشارہ بھی استعارے کے طرح مجاز ہی کی ایک قسم ہے۔ استعارے میں لفظ مستعار کے حقیقی معنی نظر انداز کر کے مجازی معنی مراد لیے جاتے ہیں اور اشارے میں اصلی معنی کی جگہ اشاراتی معنی مراد ہوتے ہیں۔

(۲) استعارے میں حقیقت اور مجاز، اصل اور تصویر میں پوری طرح امتزاج نہیں ہوتا۔ اس میں خارجی قرینہ ہوتا ہے جو حقیقت اور مجاز میں فرق کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ شاعر نے لفظ مستعار کے حقیقی معنی مراد نہیں لیے جبکہ علامت میں اس قسم کا کوئی خارجی قرینہ نہیں ہوتا داخلی یا ذہنی قرینہ ہوتا ہے۔

(۳) علامت کی صورت میں شاعر اور قادری کے درمیان مفاہمت یا معاہدہ نہایت ضروری ہے ۔تا کہ اشاراتی معنی کا تعین کر سکے۔

(۴) علامت استعارے کے بعد کا قدم اور تشبیہ کے سلسے کی آخری کڑی ہے۔

(۵) استعارہ تشبیہ سے زیادہ خطرناک اور استعارے سے زیادہ پر خطر علامت ہے کیونکہ اس میں خارجی قرینہ نہیں ہوتا اس لیے اگر اس کے استعمال میں سلیقے سے کام نہ لیا جائے تو کلام میں ابہام پیدا ہو سکتا ہے۔

بقول ممتاز حسین:

''استعارے اور سمبل کا فرق یہ ہے کہ سمبل اشیاء کے صرف رشتوں کو ظاہر کرتا ہے اسکا کوئی بھی تعلق اشیاء کی شیئیت (Thingness) سے نہیں ہوتا۔ یعنی سمبل مجردِ محض ہوتا ہے۔ اس کے برعکس استعارہ مجرد اور محسوس دونوں ہی ہوتا ہے چنانچہ یہی سبب ہے کہ سمبل میں وجہ جامع کبھی کبھی اس قدر مجرد ہوتی ہے کہ وہ سمبل نجی تلازمۂ خیال کا حامل بن جاتا ہے اور اس طرح نا قابل فہم بھی بن سکتا ہے۔''(۱۳)

علامت کو اس کے استعمال کی کثرت اور اجتماعی شعور کا حصہ بنا کر قطعیت کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں علامت میں ابہام ضروری ہوتا ہے لیکن مصنف کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی علامت کا استعمال اس طرح کرے کہ قاری تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے ان کے نزدیک علامت کا قاری تک ابلاغ بہت ضروری ہے ڈاکٹر وزیر آغا نے علامت کو استعارے کی ترقی یافتہ شکل قرار دیا ہے ان کے نزدیک جب استعارے میں سے نئے نئے معانی پھوٹتے ہیں اور وہ اپنی لغوی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے تو وہ علامت کے مقام تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اس سلسلے میں وہ ایک تمثیل کے ذریعے علامت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اگر اندھیری رات ہے اور میدان میں صرف ایک قمقمہ روشن ہے اور آپ اس قمقمے کی طرف آرہے ہیں تو جسم سے جڑا ہوا آپ کا سایہ آپ کا تعاقب کرے گا اور قدم بہ قدم مختصر ہوتا چلا جائے گا حتی کہ جب آپ قمقمے کے نیچے کھڑے ہوں گے، سایہ آپ کے قدموں میں سمٹ کر غائب ہو جائے گا۔ مگر جب آپ قمقمے سے آگے بڑھنے لگیں تو یہی سایہ آپ کے قدموں سے نکل کر آگے آگے چلنے لگے گا اور بتدریج بڑا ہوتا چلا جائے گا آنکہ اندھریوں میں جذب ہو کر معدوم ہو جائے گا۔ جب شئے ایک معنی کی حامل ہو تو ہم کہیں گے کہ یہ نشان ہے جب کہ شے ایک اور شے سے مشابہت کی بنا پر رشتہ قائم کرے تو یہ تشبیہ یا استعارہ ہے اور جب یہی شے آگے بڑھ کر معنوی توسیع کی علمبردار بن جائے تو علامت ہے''(۱۴)

مندرجہ بالا بحث میں استعارہ اور علامت کے مابین فرق روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیا گیا ہے اور استعارہ اور علامت کی حدود و قیود بھی متعین ہو گئی ہیں۔

علمائے بلاغت کے نزدیک استعارہ کی متعین کردہ تعاریف اور استعارہ کے اصول وضوابط پر سیر حاصل بحث ہو چکی اب اک نظر اہل نقد کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ وہ استعارے اور ادب بالخصوص شاعری اور استعارہ کو کس طرح دیکھتے ہیں۔

مغربی تنقید میں استعارے کے مباحث:

استعارہ اہلِ مغرب کی نظر میں ادب، بالخصوص شاعری کی زبان کا امتیازی وصف استعاراتی اظہار ہے۔ مغربی نقادوں نے استعارہ پر بہت کچھ لکھا اور اس کی اہمیت کو منوایا۔ سب سے پہلے ارسطو نے بوطیقا میں استعارے کو شاعری کا حسن اور تزئین کلام کا ایک طریقہ قرار دیا۔ ارسطو استعارے کی افادیت قائل تھا اور پر ملکہ حاصل کرنے کی تلقین کرتا تھا۔ ارسطو کے نزدیک استعارہ نئے خیالات کی پیدائش کا وسیلہ ہے ارسطو کے بقول:

> ''غریب الفاظ ہمارے دماغ کو پریشان کرتے ہیں، عام الفاظ ہمیں وہی کچھ بتاتے ہیں جو ہم پہلے سے جانتے ہیں۔ صرف استعارے کے ذریعے ہم کوئی آگاہی یا نئی فکر حاصل کر سکتے ہیں''۔ (۱۵)

ارسطو نے امکانی صورتِ حال کا رشتہ استعارے سے قائم کیا ہے اور یہی وہ اساس ہے ارسطو نے جس پر استعارے کی تعمیر کی اور استعارے کو کلام کا جوہر قرار دیا۔ ارسطو استعارے کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

> ''تبادلے کے ذریعے کسی غیر مانوس نام کا اطلاق استعارہ کہلاتا ہے۔''(۱۶)

استعارے کی مثال میں ارسطو تحریر کرتا ہے۔

۱۔ میرا جہاز یہاں کھڑا ہوا ہے۔

۲۔ سچ ہے کہ اودی سیوس کے عمدہ کارنامے دس ہزار ہیں۔

۳۔ تلوار نے جان نکال لی۔

اٹھنا، بیٹھنا یا کھڑا ہونا جانداروں کی صفت ہے جبکہ جہاز لنگر انداز ہوتا ہے۔ یہاں لنگر انداز ہونا کو کھڑا ہونا کہا گیا ہے۔ یہ بیان کی خوبصورتی کے لیے استعارے کا استعمال ہے۔ اوڈی سیوس کے کارناموں کی تعداد بھی دس ہزار نہیں ہے بلکہ دس ہزار سے مراد کثرت تعداد ہے۔ تلوار جان نہیں نکالتی بلکہ اس کا کام کاٹنا ہے لہذہ، یہ بھی استعاراتی اظہار ہے اور بیان کی یہ متبادل صورتیں استعارہ ہیں۔ خوبصورت استعارے تراشنا ہر ایک کے بس میں کہاں اس کا تعلق انسان کی فطری تخلیقی صلاحیتوں سے ہے۔

> ''استعارے کی صلاحیت کسبی نہیں ہوتی۔ یہ اختراعی ذہن کی نشانی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اچھے استعاروں کے اختراع کے لیے مشابہتیں دیکھنے والی نظر درکار ہوتی ہے۔''(۱۷)

لاطینی مفکرین سسرو(Cecero)، ہوریس(Horace) اور لائجائنس (Longines) نے ارسطو کے تتبع میں استعارے کو تزئینِ کلام کا وسیلہ گردانا، جبکہ قرونِ وسطیٰ میں استعارے نے مذہبی حیثیت حاصل کرلی اور عیسائیوں نے دنیا کو اللہ کی کتاب قرار دیا اور دنیا کو استعاروں سے مالا مال قرار دیا۔ دانتے(Dante) نے طربیہ ءخداوندی میں یہی کام کیا یعنی خدا نے جو معانی آفاق میں مجسم کیے تھے انھیں دریافت کر کے بے نقاب کیا اس بات کا اظہار دانتے نے اپنے ایک خط میں بھی کیا ہے۔ افلاطون نے زبان اور استعارے کے بارے میں کوئی بات صریح طور پر نہیں کی۔ افلاطون(Ideas) کو سچائی سے تعبیر کرتا ہے۔ تمام اشیاء کو عالم مثال کی ادھوری نقول گردانتا ہے اور شاعری پر فلسفے کی بزرگی تسلیم کرتا ہے۔ شیلی کے نزدیک زبان تخیل کی پیداوار ہے اور استعارہ وہ رشتہ ہے جو تخیل، زبان اور شاعری کو باہم مربوط کرتا ہے اور ہر ڈر کے نزدیک انسان روزِ اول سے علامتوں اور استعاروں میں سوچتا تھا اطالوی فلسفی ویکو کے خیال میں اوائلی انسانوں کے اساطیر من گھڑت کہانیاں نہ تھیں بلکہ لوگوں نے دنیا کا جو نقشہ شعر و استعارہ کی مدد سے قائم کیا تھا اسکی تفسیریں تھیں۔ محمد ہادی حسین ورڈزورتھ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ورڈزوتھ نے اپنے زمانے میں رائج پر تکلف شاعرانہ زبان کو ترک کر کے لوگوں کی بولی استعمال کرنے کا تہیہ کیا۔ کیونکہ وہ استعاراتی ہوتی ہے اور استعارہ عام زبان کا فطری عنصر ہوتا ہے۔''(۱۸)

کولرج چاہتا تھا کہ الفاظ کو اشیاء کی حیثیت حاصل ہو، جیتی جاگتی اشیا کی، اس کے نزدیک استعارہ اس مقصد کو حاصل کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔ فلپ ویلرائٹ (Philip Wheelwright) استعارے کو زبان کی مرکزی خصوصیت تسلیم کرتا ہے بلکہ وہ زبان کی تعریف ہی استعارے کی انتقال معانی کی قدرت کے حوالے سے کرتا ہے۔

ٹی۔ایس۔ایلیٹ کہتا ہے کہ:

> ''شاعری بنیادی طور پر استعاروں اور تمثالوں(images) کا معاملہ ہے۔شعر میں تمثالیں محض تزئین کا ذریعہ نہیں ہوتیں بلکہ وہ وجدانی زبان کو جوہر ہوتی ہیں''(۱۹)

مندرجہ بالا بحث سے استعارے کے حوالے سے مغربی ناقدین کی آرا واضح اور عیاں ہو گئیں۔

اردو تنقید میں استعارے کے مباحث :

اہلِ مغرب نے استعارے کو ادب ،شاعری میں مرکزی اہمیت دی اور اہل نقد نے بھی استعارے پر بہت زیادہ لکھا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اردو ادب میں ناقدین بالخصوص جدید ناقدین ،استعارہ کو اہل بلاغت سے ہٹ کر کس طرح دیکھتے ہیں اور ان کے نزدیک کلام میں استعارہ کیا کردار ادا کرتا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کے بقول:

> ''استعارے کے باب میں مغربی مفکرین نے بہت لکھا ہے۔ان کے علی الرغم ہماری شعریات میں استعارہ اتنا اہم نہیں۔استعارے کی جگہ ہمارے یہاں یعنی سنسکرت شعریات میں بھی اور عربی فارسی شعریات میں بھی مضمون کو مرکزی مقام حاصل ہے۔''(۲۰)

استعارے اور مضمون کی ترجیحات بالترتیب مغربی اور مشرقی ادب میں اپنی اہمیت کی حدیں رکھتی ہے اسی لیے فاروقی صاحب جیسے ناقد بھی مغرب کو اس حوالے سے مشرقی ادب سے ایک قدم آگے دکھاتے ہیں۔ادبی تخلیق کا پیش خیمہ تخیل ہے یعنی استعارہ تخیل کی ایجاد ہے۔

بقول عرفان صدیقی:

مگر گرفت میں آتا نہیں بدن اسکا
خیال ڈھونڈتا رہتا ہے استعارہ کوئی

اردو میں اہلِ بلاغت نے علمِ بیان کی ذیل میں استعارہ کی بہت تعریف و توصیف کی اور اسے علم بیان کا اہم ترین رکن گردانا اور کلام کا زیور قرار دیا۔ جبکہ اہل نقد میں مولانا شبلی نعمانی نے عام ڈگر سے ہٹ کر تشریح کرنے کی کوشش کی۔ شبلی نے استعارے کو فطری طرز ادا قرار دیا اور بتایا کہ تشبیہ، استعارہ شاعری اور عام زبان آوری کے خد وخال ہیں۔ان کے بغیر انشا پردازی کا جمال قائم نہیں رہتا اور جوش یا غیض و غضب میں جو کچھ زبان سے نکلتا ہے استعارات کے قالب بدل کر نکلتا ہے۔ شبلی نے محاوروں کے استعاراتی اساس پر تشکیل پانے پر بھی بحث کی اور استعارے کی ضرورت اور ماہیت پر اہم خیالات کا اظہار کیا مثلاً:

''استعارے کی حقیقت کیا ہے؟

یہ کہاں اور کیوں کر کام آتا ہے؟

اس میں ندرت اور لطافت کیونکر پیدا ہوتی ہے؟

کس طرح ایک بڑے سے بڑا وسیع خیال اس کے ذریعے سے ایک لفظ میں ادا ہو جاتا ہے؟''(۲۱)

شبلی نے اہم سوالات کو کھوجنے کی کوشش کی جس کے لیے انھوں نے عرب و عجم کی شاعری سے مثالیں بھی پیش کیں اور اردو روایت سے بھی اس کے تعلق کو جوڑا۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ نے مقدمہ شعر و شاعری میں عام ڈگر سے ہٹ کر دیکھا اور استعارے پر اہل بلاغت کے علاوہ اہلِ نقد کی توجہ مبذول کرائی۔ حالیؔ نے استعارے کو بلاغت کا رکنِ اعظم قرار دیا لکھتے ہیں کہ:

''استعارہ بلاغت کا ایک رکن اعظم ہے۔ اور شاعری کو اس کے ساتھ وہی نسبت ہے جو قالب کو روح کے ساتھ۔ کنایہ اور تمثیل کا حال بھی استعارہ ہی کے قریب قریب ہے۔ یہ سب چیزیں شعر میں جان ڈالنے والی ہیں۔ جہاں اصل زبان کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے وہاں شاعر انھیں کی مدد سے اپنے دل کے جذبات اور دقیق خیالات

عمدگی کے ساتھ ادا کر جاتا ہے اور جہاں اس کا اپنا منتر کار گر ہوتا نظر نہیں آتا وہاں انھیں کے زور سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتا ہے۔"(۲۲)

حالیؔ کے بعد اگر محمد حسن عسکری کے اردو تنقید میں استعارے سے متعلق مباحث کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے مضمون "استعارے کا خوف" میں حالی کی تنقیدی بصیرت پر کئی سوالات اٹھا دیے اور حالی کی استعارے کے بارے میں ترجیح دی گئی تعریف کو تقریباً رد کر دیا عسکری کی بحث میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ "اصل زبان" الگ چیز ہے استعارہ الگ چیز۔ عسکری نے اسی قبیل کے نقادوں کو اردو والوں کے دل میں استعارے کا خوف پیدا کرنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ عسکری کہتے ہیں کہ جو شخص یا جماعت استعارے سے ڈرتی ہے وہ دراصل زندگی کے مظاہر اور زندگی کی قوتوں سے ڈرتی ہے، جینے سے گھبراتی ہے۔ حالیؔ کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے استعارے کو "اصل زبان" سے الگ سمجھا جبکہ ایک ایک فقرہ استعارہ ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

" اپنے ذہن کے ذریعے آدمی جبلتوں سے بھاگنا چاہتا ہے۔ لیکن ذہن کی کمین گاہ میں خود جبلت چھپی ہوئی بیٹھی رہتی ہے۔ غرض ہم زبان سے جو فقرہ بھی کہیں اس میں بھولا ہوا یا زبردستی بھلایا ہوا تجربہ اور پوری عمر کا تجربہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ یعنی ہمارا ایک ایک فقرہ استعارہ ہوتا ہے استعارے سے الگ "اصل زبان" کوئی چیز نہیں کیونکہ زبان خود استعارہ ہے۔ چونکہ زبان اندرونی تجربے اور خارجی اشیاء کے درمیان مناسبت اور مطابقت ڈھونڈنے یا خارجی اشیاء کو اندرونی تجربے کا قائم مقام بنانے کی کوشش سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے تقریباً ہر لفظ ایک مردہ استعارہ ہے۔ اصل زبان یہی ہے۔"(۲۳)

عسکری نے مردہ استعارے کی بات کی۔ یعنی زندہ استعارہ بھی کوئی شے ہے۔ روز مرہ میں پانی محض پیاس بجھانے کے کام آتا ہے مگر ادبی تخلیق میں اس سے مراد زندگی ہے۔ یعنی پانی محض پیاس بجھانے والی چیز کے طور پر مردہ استعارہ ہے اور اگر اس سے مراد زندگی لی جائے تو زندہ استعارہ ہے۔ عسکری کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہر لفظ ایک مردہ استعارہ ہے مگر اس میں زندہ استعارہ بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے مگر یہ تخلیق کار پر منحصر ہے کہ وہ اسے زندہ استعارہ بنا پاتا ہے یا نہیں ایک پھول کے

مضمون کو سو رنگ سے باندھ سکتا ہے یا نہیں۔ نئے استعارے اور علامات خلق کر سکتا ہے یا نہیں ۔بقول ظفر اقبال:

کچومر معانی کا نکلا ہے خوب

کہ سارا ہی بوجھ استعارے پہ تھا

(تنصیب،اب تک،۵،کلیاتِ ظفر اقبال،ص:۳۴۱۸)

مشرقی ادب کے مضمون کو ترجیح دینے والے شعرا نے جب استعارہ سازی کی راہ پہ اپنے نئے اور منفرد معانی کے رنگ نکالنے چاہے اور اک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی سعی کی تو ظفر اقبال کے اس شعر جیسی ہی کچھ مضحکہ خیز صورتِ حال کا سامنا بھی ہوا جبکہ قادر الکلام شعرا کے ہاں کامیاب تجربات بھی دیکھنے کو ملے۔

محمد حسن عسکری کے نزدیک استعارے کا خوف اصل میں غیر عقلی تجربات کا خوف ہے۔ استعارے سے انحراف زندگی سے انحراف ہے۔ استعارہ اپنے ذاتی تجربے اور خارجی اشیاء کے درمیان مناسبت ڈھونڈنے کا نام ہے بقول عسکری:

> ''استعارہ انسان اور کائنات کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے کا ایک وسیلہ ہے''(۲۴)

انسان، کائنات اس کے مظاہر اور فطرت سے وابستہ علامات کا انسان کے لاشعور اور تحت الشعور سے جو رشتہ ہے وہ اسے نہ صرف جاگتے میں خیالات کے گھوڑے دوڑانے کی طرف مبذول رکھتا ہے بلکہ حالتِ نوم میں بھی اس کے لیے خواب کا در کھلا رہتا ہے۔ جو اس کی شعوری، لاشعوری اور تحت الشعوری خواہشات کا عکس بھی ہوتا ہے اور انسان کی طبع میں پائے جانے والے تحیر کا آئینہ دار بھی ہے ۔ فطرت خارجی اور داخلی دنیا میں رابطہ پیدا کرتی ہے اور زندگی کو نئے معانی عطا کرتی ہے۔ آدمی جب اپنے اندر جھانکتا ہے اور اترتا ہے تو عرفانِ ذات حاصل کرتا ہے من کی دنیا آباد کرتا ہے۔انتظار حسین کہتے ہیں کہ:

> ''ہمارے اندر ایک تاریک براعظم سانس لے رہا ہے''(۲۵)

یعنی داخلی اور خارجی دنیا کا یہ ربط استعارے کی مرہونِ منت ہے۔ ممتاز حسین نے بھی استعارے کو اہل بلاغت سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کی اور انقلابی استعارہ کی اصطلاح وضع کی۔ استعارہ انقلابی کا ذکر کرتے ہوئے ممتاز حسین کہتے ہیں کہ :

> ''علمِ بیان کی کتابوں میں استعارے کی مختلف قسمیں درج ہیں جن میں استعارہ اصلیہ،استعارہ تبعیہ،استعارہ مطلقہ،استعارہ بالتصریح،استعارہ بالکنا یہ حتّٰی کہ استعارہ تخیلیہ (ایں چہ بوالعجبی است) تک درج ہے۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ان میں ایک استعارے کا ذکر نہیں جو ان سب پر بھاری ہے۔ اس کو استعارہ انقلابی کہتے ہیں۔ جو استعارے کے تمام حدود کو توڑ کر اس طرح نمودار ہوتا ہے کہ علم بیان والے منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ بڑا شاعر اپنے انہی انقلابی استعاروں سے پہچانا جاتا ہے۔ میرؔ کا شعر ہے۔۔۔
>
> کہاں آتے میسر تجھ سے مجھ کو خُود نما اتنے
> یہ حسنِ اتفاق آئینہ تیرے رو برو ٹوٹا
>
> (میرؔ)
>
> یہ وہ انقلابی استعارہ ہے جو علم بیان کے معلموں کی تعریفوں سے آزاد ہے۔ یہ استعارہ میرؔ نے اردو میں فارسی زبان سے داخل کیا لیکن اس کا استعمال ایسا کیا گیا ہے کہ اس کا اپنا بن گیا ہے ۔اس کی معنویت لامحدود وسعتِ خیال کی حامل ہے۔ یہ اپنی ذات سے ایک کتاب ہے۔ اس میں انسان کی اپنی خود نمائی پر ہی زور نہیں ہے بلکہ اس کی کبریائی پر بھی زور ہے۔''(۲۶)

استعارہ وسعتِ زبان کا ذریعہ ہے کیونکہ استعارہ معین معانی سے غیر معین معانی کی طرف سفر کرتا ہے یعنی استعارہ معانی میں تحرک پیدا کرتا ہے اور زبان میں اضافے کا موجب بنتا ہے۔ گوپی چند نارنگ اپنی کتاب سانحہء کربلا بطور شعری استعارہ میں رقمطراز ہیں کہ :

> ''شعریات کا سب سے بڑا مسئلہ معنیات کے ذہنی جزو مد کے حُسن کارانہ اظہار پر قدرت حاصل کرنا ہے۔ اظہار کے وسائل ان گنت ہیں، لیکن ان میں جو مرکزیت استعارے کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے پیرائے کو نہیں۔۔۔ زبان کے استعاراتی تفاعل کے دوران لفظ قمقموں کی طرح جلتے بجھتے رہتے ہیں ،اور بیک وقت معنی در معنی چراغاں ہوتا رہتا ہے۔''(۲۷)

استعارہ زبان کے پھیلاؤ کا باعث ہے جب کوئی لفظ استعارے میں ڈھلتا ہے تو معانی کی ایک نئی دنیا آباد ہو جاتی ہے اور فن پارہ بھی جمالیاتی لذت کا حامل ہو جاتا ہے۔ بقول محمد ہادی حسین:

> ''شاعری استعاروں کے ذریعے ممکناتِ وجود کے نت نئے تصور وضع کر کے انسانی ادراک اور شعور کے اُفق کو وسعت عطا کرتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ زبان کے گنجینے کو بھی نئے الفاظ اور نئے معانی سے مالا مال کرتی جاتی ہے۔''(۲۸)

استعارے کے جدید مباحث نے اردو ادب میں رائج مباحث پر سخت سوال اٹھائے اور اسے رد و قبول کے مراحل سے گزارا۔ جدید ناقدین کی اس کاوش نے تنقید کے میدان میں نئے مباحث کے در وا کیے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے بقول:

> ''ایک زمانے تک یہ تصور راسخ رہا ہے کہ استعارہ عام زبان اور شاعرانہ زبان سے حدِ فاصل قائم کرتا ہے۔ اب یہ واضح ہے کہ استعارہ سازی کی صلاحیت عام زبان میں بھی موجود ہے۔ شاعری اس صلاحیت کو زبان میں داخل نہیں کرتی، اس کا زیادہ اور بہتر استعمال کرتی ہے۔ استعارہ کی بنیاد مماثلت پر ہے اور زبان کا پورا نظام ہی مماثلت(Similarity) اور قربت (Contigenity) کے رشتوں پر استوار ہے۔''(۲۹)

اہل مغرب نے استعارے کے ضمن میں بہت لکھا ہے۔ مغرب میں ایسا کوئی قابل ذکر نقاد نہیں جس نے استعارے کی راگنی نہ چھیڑی ہو۔ ہمارے ہاں چیزوں کو باریک بینی سے دیکھنے کا رجحان کم ہے اور جب معاملہ استعارے کا ہو تو محمد حسن عسکری کے اہم مضمون کے عنوان جیسی کیفیت کا سامنا ہی ہوتا ہے کہ ہمارے ناقدین نے اس بحث میں ہاتھ ڈالنے سے خود کو دور ہی رکھا۔ استعارے کا یہ خوف جو ہمارے ناقدین کو لاحق ہے ہمارے ہاں قابل قدر مباحث کو فروغ دینے میں آڑے آتا رہا۔ اگرچہ محمد حسن عسکری نے استعارے کے جو جدید مباحث اٹھائے اس کے بعد اردو ادب کے اہم ناقدین اس طرف متوجہ ہوئے اور استعارہ کو اہل بلاغت سے گریز کر کے دیکھنے کی سعی کی۔ معید رشیدی اپنے مضمون استعارے کا بھید میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''اردو میں استعارے کی ماہیت پر غور و فکر اور اظہارِ خیال کا رواج عام نہیں۔۔۔ ہمارے آج کے ناقد کو لفظ و معنی کے رشتوں پر غور کرنے کی زحمت

نہیں، معنی کے منابع کیا ہیں؟ تشبیہ کی ندرت کس میں ہے؟ استعارے کی ماہیت کیا ہے؟ علامت کیونکر خلق ہوتی ہے؟۔۔۔ ہمارے ہاں حالی، شبلی۔۔۔۔ محمد حسن عسکری، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، وارث علوی، شمیم حنفی اور قاضی افضال حسین جیسے کتنے ناقدین ہیں جو ادب کی نظری اساس پر سوچنے، اطلاقی نمونے پیش کرنے اور اس کے امکانات کو ضابطہ تحریر میں لانے کی ہمت کرتے ہیں، کچھ لوگ کہیں گے کہ ہم استعارے کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں لیکن اس جھنجھٹ میں کیوں پڑنے جائیں۔ استعارے کا مسئلہ تو اہلِ بلاغت طے کریں، اور استعارہ ایسی کوئی شے بھی نہیں کہ اس کی تعریف یا تفہیم مشکل ہو"(۳۰)

استعارے کے مباحث کو سمیٹتے ہوئے سید عابد علی عابد اپنی کتاب البیان میں لکھتے ہیں کہ:

"استعارے کے مباحث دراصل علوم شعریہ کیلئے جانِ کلام کی صورت رکھتے ہیں کہ پیکر تراشی، تمثال کاری، تخیل کی اختراعی قوت اور ابدائی تصریف کا پتہ استعارے ہی کی خوبی و محبوبی سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ استعارے کی خوبی سے ذوقِ سلیم کا گہرا تعلق ہے جب تک خدا نے انسان کو اس نعمت سے بہرہ یاب نہ کیا ہو گا وہ استعارے کے حسن اور اس کی دل پذیری اور دل نشینی کے شعور سے محروم رہے گا۔"(۳۱)

ضرورت اس امر کی ہے کہ استعارے جیسے اہم ترین موضوع پر اہل نقد کو خصوصی توجہ دینی چاہیے تاکہ اس پیکرِ اسرار کو مزید کھولا اور کھوجا جا سکے اور شعر و ادب کے تخلیقی چشموں اور زمزموں سے آبِ حیات کشید کیا جا سکے۔

بقول ظفر اقبال:

میں ایک بار تو بس یُوں ہی اس سے در گزرا
وگرنہ تھی کوئی حیرت بھی استعارے میں

(تجاوز، اب تک، ۳، کلیاتِ ظفر اقبال، ص: ۱۹۷۲)

استعارے کے مباحث کا جائزہ لیتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں شاعری کے اساتذہ اور بیان و بدیع کے شارحین نے مختلف اقسام بھی گنوائیں اور ان کے ارکان کو بھی واضح کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ

شاعری سے اس کی مثالیں بھی پیش کی گئیں لیکن ضرورت اس امر کی تھی کہ ان اقسام کا معروضی تجزیہ کرتے ہوئے استعارہ وضع کرنے کے اسباب و علل پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی جاتی۔ مغربی اور مشرقی تنقید کا یہ فرق ہماری جدید درسی اور ادبی زندگی میں قدیم مشرقی علوم سے عدم مطابقت کے باعث اتنا قابلِ عمل بھی نہ رہا جتنی اس کی اہمیت ہماری کلاسیکی شاعری میں نظر آتی ہے جس میں ہمارے شعرا کا غالب رجحان ایک ہی مضمون میں نئی سے نئی نکتہ آفرینی کرنے کی طرف رہا لیکن اپنے علامتی نظام اور استعارہ وضع کرنے کی طرف وہ بہت کم متوجہ ہوئے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد پادشاہ ،(مولف)، فرھنگ آنندراج، کتاب فروشی خیام، تہران، ۱۳۳۵ھ، جلد ا، ص ۸۳۱

۲۔ مزمل حسین، ڈاکٹر، حدائق البلاغت، مثال پبلشرز، فیصل آباد، جنوری ۲۰۰۹ء ص: ۱۶

۳۔ عابد علی عابد، سید، البیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء ص: ۵۸

۴۔ نجم الغنی رامپوری، مولوی ،بحر الفصاحت (طبع نو) مقبول اکیڈی لاہور، ۱۹۸۹ جلد، ۲ ص: ۱۳۷

۵۔ سید تصدق حسین رضوی، مولوی ،لغاتِ کشوری، مطبع نامی منشی نول کشور، لکھنو طبع ۱۹، ۱۹۵۲ء ص ۲۱

۶۔ محمد پادشاہ، (مولف) فرھنگ آنندراج، کتاب فروشی خیام، تہران، جلد ا، ص ۲۶۹

۷۔ عبدالحق وابو للیث صدیقی (مولفین) اردو لغت تاریخی اصول، اردو ڈکشنری بورڈ، کراچی، ۱۹۸۳ جلد ۵ ص ۲۳۳

۸۔ مرزا سجاد بیگ دہلوی، تسھیل البلاغت، محبوب المطابع برقی پریس دہلی س۔ن۔ ص: ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱

۹۔ نجم الغنی رامپوری، مولوی، بحر الفصاحت، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۹ ص: ۸۱۱

۱۰۔ ممتاز حسین، ادب اور شعور، ایجوکیشنل پریس، کراچی، بارِ اول نومبر ۱۹۶۱ء ص: ۹۰

۱۱۔ ایضاً، ص، ۱۰۱

۱۲۔ عابد علی عابد، سید، البیان، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۶، ص: ۷۹

۱۳۔ ممتاز حسین، ادب اور شعور، ایجوکیشنل پریس کراچی، بار اول نومبر ۱۹۶۱ء ص: ۱۹۷

۱۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''علامت کیا ہے'' مشمولہ: علامت، جنوری ۱۹۹۶ء، لاہور، ص: ۱۶

۱۵۔ محمد ہادی حسین، زبان اور شاعری، مجلس ترقی ادب لاہور، فروری ۱۹۸۴، ص: ۱۰۲

۱۶۔ ارسطو، شعریات، مترجم: شمس الرحمٰن فاروقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸، ص ۱۰۸

۱۷۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، مغرب کے تنقیدی اصول، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان ۲۰۱۲، ص ۷۵

۱۸۔ محمد ہادی حسین، زبان اور شاعری، مجلس ترقی ادب لاہور، فروری ۱۹۸۴ ص۔ ۱۰۹

۱۹۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، مغرب کے تنقیدی اصول، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ ص ۲۵۷

۲۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شعرِ شور انگیز، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی ۲۰۰۶، (تیسرا ایڈیشن)، ص ۶۱

۲۱۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، جلد چہارم، طبع جدید ۲۰۰۷، ص ۳۹

۲۲۔ خواجہ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعرو شاعری، کشمیر کتاب گھر اردو بازار لاہو، س۔ن ص۔ ۱۴۵

۲۳۔ محمد حسن عسکری، مجموعہ حسن عسکری، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۴۔ ص ۱۹۶

۲۴۔ ایضاً، ص: ۲۰۰

۲۵۔ انتظار حسین، ''بکرم، بیتال اور افسانہ''، مشمولہ: علامتوں کا زوال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۳، ص: ۱۲۳

۲۶۔ ممتاز حسین، ادب اور شعور، ایجوکیشنل پریس کراچی، بار اول نومبر ۱۹۶۱ء ص: ۱۰۱

۲۷۔ گوپی چند نارنگ، سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱، ص: ۱۲

۲۸۔ محمد ہادی حسین، زبان اور شاعری، مجلس ترقی ادب لاہور، فروری ۱۹۸۴ ص۔ ۱۱۵

۲۹۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، ''شعریات ظفر: چند باتیں''، مشمولہ: نزول، شمارہ نمبر ۸، دسمبر ۲۰۱۳ء، ادارت: سید اذلان شاہ، گوجرہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ص ۱۳۰

۳۰۔ معید رشیدی، ''استعارے کا بھید''، مشمولہ: ذہنِ جدید، شمارہ نمبر ۵۹، دسمبر ۲۰۱۰ء تا فروری ۲۰۱۱ء، ترتیب: زبیر رجوی، نئی دہلی، ص ۲۶

۳۱۔ عابد علی عابد، سید، البیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء ص: ۲۳۱

باب سوم

ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ اور اُردو غزل کی روایت

۱۔ **اردو غزل میں دل کے استعارے کی روایت :**

میر تقی میرؔ ــــــــ غالبؔ ــــــ اقبالؔ ــــــ ظفر اقبال۔

۲۔ **ظفر اقبال کی استعارہ سازی:**

۳۔ **ظفر اقبال کی غزل میں دل کے استعارے کی روایتی جہات:**

دل گھر کا استعارہ ـــــ دل محبت، جنون، وحشت کا استعارہ

دل وسعتِ زندگی و کائنات کا استعارہ

۱۔ اردو غزل میں دل کے استعارے کی روایت

ظفر اقبال عصرِ حاضر کے اہم جدید شاعر ہیں۔ انھوں نے جہاں اپنے لیے الگ راہیں کشید کیں اور نت نئے تجربات کیے، لسانی تشکیلات کیں، زبان کو نئے سانچے میں ڈھالنے اور اردو کو وسعت دینے کے لیے اردو میں پنجابی، سندھی، پشتو، بنگالی کی پیوند کاری کی اور زبان کو وسعت دی۔ جہاں غزل کے نئے امکانات دریافت کرنے کی سعی کی وہاں اردو غزل کی روایت سے بھی جُڑے رہے۔ ویسے بھی روایت سے بے خبر انسان کے لیے نئے تجربات، نئے امکانات کی تلاش شاید ممکن ہی نہیں۔ اس جوکھم میں صرف وہی پڑ سکتا ہے جو روایت سے مکمل آگاہ ہو اور اسے جذب کر چکا ہو۔

اُردو غزل کی روایت میں دل کے مضمون کو باندھنے کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی اردو غزل کی روایت۔ دل ہی تو شاعری کا مرکز و محور ہے۔ اسی دل ہی کی وجہ سے تو سب جھمیلے ہیں اور اسی دل ہی کی وجہ سے سب رونق میلے ہیں۔ یعنی دل ہی تخلیقِ شعر کا بنیادی محرک ہے۔ شاعری علم، بیان، تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل، کنایہ، اور ضائع بدائع کے بنا نثر ہی تو ہے، سپاٹ رو کھی پھیکی، بے لطف نثر کیونکہ عمدہ نثر بھی علم بیان اور بدیع سے آراستہ ہوتی ہے ورنہ اسے بھی شاید تخلیقی نثر نہیں کہا جا سکتا جبکہ شاعری تو تشبیہ، استعارے کے بغیر بے رنگ، بد ذائقہ اور سطحی سی کوئی چیز لگتی ہے۔ جیسے دل شعری روایت کا مرکز و محور ہے اسی طرح دل کا استعاراتی استعمال بھی اردو روایت شاعری بالخصوص غزل کی روایت کا ازل سے حصہ اور خاصہ رہا ہے۔ اردو غزل کا کوئی بھی قابل ذکر شاعر ایسا نہیں ہے جس نے دل کو موضوعِ شعر نہ بنایا ہو یا دل کا مضمون نہ باندھا ہو یہ الگ بات ہے کہ وہ دل کو استعارہ بنانے میں کس درجہ پر فائز ہوا یا کامیاب ٹھہرا۔ اردو غزل کی روایت میں ولی دکنی سے لے کر ظفر اقبال تک اور ظفر اقبال سے آج کے نووارد شعرا تک سبھی شعرا نے یقیناً دل کو بطور استعارہ باندھا۔ مگر دل کے استعارے کو استعارہ بنانے میں اور نئے معانی اور مفاہیم تلاشنے میں کامیابی کس حد تک ہوئی یہ الگ موضوع ہے۔ ولی دکنی کہتے ہیں کہ:

مجھ دل کے کبوتر کوں، پکڑیا ہے تری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے، ٹک اس کوں چھڑاتی جا

(ولی دکنی)

اردو غزل میں ظفر اقبال سے قبل میر تقی میر، غالب اور اقبال تینوں ایسے شعرا ہیں جنھوں نے دل کے استعارے کو بے حد برتا اور دل کو الگ معانی و مفاہیم سے روشناس کرایا۔ اگر یہ کہا جائے کہ دل بطور استعارہ میر، غالب اور اقبال کی استعارہ سازی میں نمایاں اہمیت کا حامل ہے تو بے جا نہ ہوگا ویسے تو ان تینوں شاعروں نے دل کے استعارے کو مختلف جہات میں استعمال کیا لیکن میر تقی میر کے ہاں دل، دلی کا استعارہ، غالب کے ہاں جذبہ اور اقبال کے ہاں دل، عشق کے استعارے کے طور پر بہت نمایاں اور واضح ہو کر آیا ہے۔ میر، غالب اور اقبال نے دل کے استعارے کو نئے معانی کا ایسا لباس پہنایا ہے اور ایسا فنکارانہ اظہار کیا ہے کہ میر کے ہاں دل، دلی، غالب کے ہاں جذبہ اور اقبال کے ہاں عشق میں ڈھل گیا ہے بقول محمد ہادی حسین:

> ''شاعری استعاروں کے ذریعے ممکناتِ وجود کے نئے نئے تصور وضع کر کے انسانی ادراک اور شعور کے افق کو وسعت عطا کرتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ زبان کے گنجینے کو بھی نئے الفاظ اور نئے معانی سے مالا مال کرتی جاتی ہے۔''(۱)

میر کی غزل میں دل نئے تصور، نئے شعور اور نئے آہنگ میں برتا گیا اور میر نے دل کو دلی بنا دیا۔ کیونکہ میر جیسے حساس طبع شاعر نے دلی کو اپنی آنکھوں کے سامنے لٹتے، اجڑتے دیکھا تو دلی کا غم میر کے غم میں سما گیا۔ چند اشعار دیکھیے:

؎ دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا
رات کو سینہ بہت کوٹا گیا

؎ دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

؎ منزل اس مہ کی رہا جو مدتوں اے ہم نشیں
اب وہ دل گویا کہ اک مدت کا ماتم خانہ تھا

؎ قصرِ جناں تو ہم نے دیکھا نہیں جو کہیے
شاید نہ ہووے دل سا کوئی مکاں زمیں پر

؎ شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اُس کے گئے
ایسا اجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

؎ دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم
یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا

(میر تقی میر)

ایسا ہر گز نہیں کہ میرؔ نے دل کو صرف دلی کے استعارے کے طور پر برتا ہے بلکہ انھوں نے دل کو کئی اور حسین قالب گھر، عشق، دریا، صحرا، شمع وغیرہ میں بھی ڈھالا ہے اور کیوں نہ ہو کہ وہ خدائے سخن ٹھہرے مگر میر کے دل کا مرکزی استعارہ دلی ہے۔

غالبؔ، میرؔ کے بعد معتبر غزل گو شاعر ہیں۔ غالب کے ہاں دل کا استعارہ جذبہ کے طور پر بھرپور انداز میں استعمال کیا گیا اور بطور جذبہ فنکارانہ چابکدستی سے دل جذبہ ہی بن گیا ہے۔ غالب کے ہاں بھی دل کے استعارے کو کئی اور پیراہن بھی پہنائے گئے جو اپنی جگہ دیدہ زیب ہیں مگر نمایاں استعاراتی پہلو دل بطور جذبہ ہی ہے۔ مثلاً

؎ یہ ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

؎ ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گراندیشے میں ہے
آبگینہ تندیء صہبا سے پگھلا جائے ہے

؎ تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پُوچھو
حذر کرو میرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

(غالب)

اقبال، میر، غالب کے بعد ایک معتبر حوالہ ہیں اور میر و غالب کی موجودگی میں اپنی الگ شعری دنیا بسانے میں کماحقہ کامیاب ٹھہرے، اقبال ایک بڑے شاعر ہیں اور اپنا الگ علامتی اور استعاراتی نظام رکھتے ہیں۔ اقبال کے ہاں دل عشق کے استعارے کے طور پر بے حد نمایاں ہے۔ ویسے بھی اقبال کی شاعری کا مرکز و محور بھی عشق ہی ہے۔ اقبال کے ہاں دل ہی عشق ہے۔ مثلاً

؎ پنپ سکا نہ خیاباں میں لالۂ دل سوز
کہ ساز گار نہیں یہ جہانِ گندم و جو

؎ خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے
خرد بے زار دل سے، دل خرد سے

؎ کس قدر بے باک دل اس ناتواں پیکر میں تھا
شعلۂ گردوں نورداک خاکستر میں تھا

؎ ہر حال میں مرا دل بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غُنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

؎ ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

(اقبال)

بڑا شاعر جب بھی کسی لفظ کو استعارے میں ڈھالتا ہے تو اس کا حق ادا کرتا ہے اور وہ لفظ خود بخود اپنے نئے معانی کھولتا چلا جاتا ہے اور بالکل غیر مانوس نہیں لگتا، یعنی مجازی معنی ہی حقیقی لگتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

> ''زبان کے استعاراتی تفاعل کے دوران لفظ قمقموں کی طرح جلتے بجھتے رہتے ہیں اور بیک وقت معنی در معنی چراغاں ہوتا رہتا ہے۔''(۲)

مندرجہ بالا بحث سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری، غزل کی روایت میں دل بطور استعارہ روایت کا بھرپور حصہ رہا ہے اور ظفر اقبال اس شعری روایت سے مکمل آگہی رکھتے ہیں۔ ظفر اقبال اردو غزل

کی روایت کے امین شاعر ہیں۔انھوں نے بے شک اس روایت سے فیض یاب ہونے کے ساتھ ساتھ اس کو جلا بخشی اور بھرپور اضافہ کیا اور جدت پیدا کی۔

ظفر اقبال ایک انٹرویو میں کہتے ہیں کہ :

''دیکھیں روایت کو میں نے کبھی نہیں چھوڑا، روایت وہ زمین ہے جس پر ہم کھڑے ہیں۔اس کے بغیر تو ہم ہوا میں معلق ہو جاتے ہیں تو میں نے روایت سے بغاوت ایک حد تک تو کی ہے مگر روایت کو میں نے اپنے ساتھ ساتھ رکھا ہے۔''(۳)

ظفر اقبال کی وجہ شہرت الفاظ کو نئے معانی و مفاہم میں استعمال کر کے زبان و بیان کی نئی فضائیں آباد کرنا ہے۔ ظفر اقبال کے لسانی تجربات بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں کیونکہ وہ زبان کو وسعت دینا چاہتے ہیں۔

ناچار ظفر گرمیٔ گفتار کے ہاتھوں
کچھ اور ہوئے جاتے ہیں الفاظ پگھل کر

(گلافتاب،اب تک ۱،کلیاتِ ظفر اقبال، ص:۱۷۲)

ظفر اقبال گلافتاب میں لکھتے ہیں کہ :

''یہ تازہ خون اردو زبان کی موجودہ تھکن اور پژمردگی دور کرنے کے لیے ضروری تھا اور کلی شیر کا یہ پہاڑ کاٹنے کیلئے جہاں میں نے لفظوں کو نئے جوڑ توڑ سے روشناس کیا ہے، وہاں کسی قدر توڑ پھوڑ بھی روا رکھی ہے اور بے شمار تلوار اُلا رلحوں سے سلامت نکل آیا ہوں۔ اس ڈسٹورشن سے لفظوں کی شخصیت اندر سے بھی بدلی ہے، نئی ساز باز سے لفظوں کے مابین نئے رشتے استوار ہوئے ہیں اور ابلاغ کی نئی سطحیں دریافت ہوئی ہیں۔''(۴)

ظفر اقبال مکھی پہ مکھی مارنے والا شاعر ہر گز نہیں بلکہ ایک بیدار مغز فنکار ہے جو روایت کا پاسبان بھی ہے اور مہم جُو بھی اور نئی راہوں کا خُو گر بھی۔ ظفر اقبال نے دل کے استعارے کو روایتی انداز میں بھی استعمال کیا اور اس میں کمال جدت بھی پیدا کی۔

۲۔ ظفر اقبال کی استعارہ سازی:

ظفر اقبال بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ان کی غزل میں استعارہ بہت استعمال ہوا ہے اور استعارہ بھی متحرک استعارہ، نہ کہ مردہ استعارہ۔ نئی دنیاؤں کی سیر کراتا ہوا استعارہ، ہر آن، ہر گھڑی نئے رنگ بکھیرتا ہوا استعارہ۔

ظفر اقبال کی غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ وہ استعارہ سازی فکر کے طور پر، شعوری طور پر کرتے ہیں اور استعارہ کو شعر کی جان جانتے ہیں۔ان کے اشعار، اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ اپنے نئے شعری ذائقوں میں نئے استعاروں کا اہتمام کرتے ہیں اور قاری کو الفاظ کے معانی کے نئے ذائقوں سے آشنا کرتے ہوئے داد و تحسین لیتے چلے جاتے ہیں۔ ظفر اقبال نے اپنے اشعار میں اس طرف بھرپور اشارے کیے ہیں اور قاری کی الجھن دور کرنے کیلئے بطور خاص استعارے کا لفظ اپنے کئی شعروں میں استعمال کرتے ہوئے اس جانب توجہ مبذول کرائی ہے کہ بھئی ، سرسری نہ گزر جانا بلکہ، ہر جا جہانِ دیگر ہے۔ مثلاً چند اشعار دیکھیئے

ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے کہ آئندہ ہماری
علامت کیا رہے گی، استعارہ کیا بنے گا

(ترتیب .اب تک ۲، کلیاتِ ظفر اقبال، ص: ۱۲۹۳)

اس شعر میں ظفر اقبال توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ آنے والا قاری میرے جہان شعر سے علامتی و استعاراتی استعمال پر ضرور توجہ دے اور دیکھے کہ میں نے کس فنکارانہ انداز میں استعارے بنائے۔ دوسرا نکتہ جو مندرجہ بالا شعر سے اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شاعر شعوری طور پر استعارہ اور علامت کے نئے امکانات کو برت رہا ہے۔ اس کے پیشِ نظر جہاں اپنی کامیابی ہے وہیں ایک خوف بھی ہے کہ شاید یہ سارا تجربہ رد کر دیا جائے۔

میں ایک بار تو بس یُوں ہی اس سے درگزرا
وگرنہ تھی کوئی حیرت بھی استعارے میں

(تجاوز .اب تک ۳، کلیاتِ ظفر اقبال، ص: ۱۹۷۲)

شعر اپنے اندر شاعر کے سرسری مشاہدے اور مطالعے کو رد کرتے ہوئے شاعر کی ذمہ داریوں کا تعین کرتا نظر آرہا ہے کہ اصیل شاعر کو کسی بھی شے سے سرسری گزرنا نہیں چاہیے بلکہ ہر مظہر ایک علامت یا استعارہ ہے جو کسی اور شے کی طرف اشارہ کناں ہوتا ہے۔استعارے کی یہی حیرت ظفر اقبال کے ہاں ہنومان جیسے کردار کی مختلف جہات اور صورتوں میں بھی منعکس ہوتی ہے جبکہ اس واحد استعارے کے علاوہ بھی وہ بہت سے روایتی کرداروں کو جدید معانی کا لباس پہناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔یوں ان کا تصورِ عشق اور تصورِ حسن بھی ہمیں روایت سے مختلف نظر آتا ہے جو محض ایک جذبے تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ ما بعد جدید عہد میں وہ فرد کے انتشار کو بھی اپنے جدید استعاروں کے ذریعے حسن و عشق کے معاملات میں سمو دیتے ہیں۔

استعارہ اصل سے ہونے نہ پائے گا الگ
اس طرح سے پھول پر اس نے کھلایا پھول ہے

(تجاوز ،اب تک ۳،کلیاتِ ظفر اقبال، ص:۱۹۷۵)

ظفر اقبال قاری اور نقاد کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرا رہے ہیں کہ میں نے استعارے یوں بنائے ہیں جیسے پھول کھلنے کا عمل اور پھول در پھول کھلنا، دیدہ زیب اور دلکش، دل کو موہ لینے والے استعارے۔

استعارہ بھی اب تو ظفر
استعارہ نہیں لگ رہا

(تنسیخ،اب تک، کلیات ظفر اقبال، جلد چہارم ص:۲۴۸۷)

کوئی ترکیب، کوئی استعارہ
جو کچھ ہو جائے بے چاروں کی بہبود

(رطب ویابس، اب تک ۱،کلیاتِ ظفر اقبال، ص:۱۳۳۲)

یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات لفظ استعارے میں نہیں ڈھل پاتا اور جو فنکار زور زبردستی کے استعارے تخلیق کرے وہ تخلیق کی دوسری نزاکتوں اور لطافتوں سے دور

نکل جاتا ہے۔ یعنی استعارہ سازی کی جائے مگر یہ نہ ہو کہ کھینچ تان کے شعر بد مزہ اور کرِ اکرا ہو جائے۔

مندرجہ بالا اشعار اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ظفر اقبال کی شاعری سیدھی، سپاٹ شاعری نہیں ہے بلکہ اس میں ایسی استعاراتی دنیائیں آباد ہیں کہ سیدھا سادا شعر بھی غور و توجہ کا متقاضی ہے۔ پرت در پرت معانی و مفاہم کا اہتمام ہے۔ ذرا سی توجہ سے شعر کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے اور قاری حیرتوں کے سمندر میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ نئی دنیاؤں کی سیر کرتا ہے اور ان رنگوں سے آشنا ہوتا ہے جو اس کی نظر نے پہلے کبھی نہیں دیکھے، نہ ہی اردو شعری روایت میں ظفر اقبال کے علاوہ کسی شاعر کے ہاں لفظ استعارہ اتنی فراوانی سے دکھائی دیتا ہے۔ میر نے کہا تھا۔

؎ تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی تیرا ہی ذرہ ظہور تھا

؎ لالہ و گل کو تجھ سے کیا نسبت
نا مکمل سے استعارے ہیں

اسی طرح عرفان صدیقی کا یہ شعر کہ:

؎ مگر گرفت میں آتا نہیں بدن اُس کا
خیال ڈھونڈتا رہتا ہے استعارہ کوئی

ظفر اقبال استعارہ اور استعارہ سازی کو کس قدر ضروری گردانتے ہیں اور اس کو ترسیلِ ابلاغ اور وسعتِ زبان کے ساتھ ساتھ فن کی معراج جانتے ہیں اس کا کچھ اندازہ مندرجہ بالا اشعار سے بھی ہو رہا ہے جن میں شاعر استعارے کی طرف اپنے شعوری رجحان کا اشارہ کر رہا ہے۔ بقول ارسطو:

> ''استعارے کی صلاحیت کسبی نہیں ہوتی، یہ اختراعی ذہن کی نشانی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اچھے استعاروں کی اختراع کے لیے مشابہتیں دیکھنے والی نظر درکار ہوتی ہے''(۵)

استعاروں کی تشکیل کے لیے مشاہدہ اور اختراعی ذہن بنیادی شرط ہے اور تیسری چیز فن پر دسترس ہے ورنہ استعارہ سازی ممکن ہی نہیں۔ یہ تینوں چیزیں قدرت نے ظفر اقبال کو بڑی وافر

مقدار میں عطا کی ہوئی ہیں اور انھوں نے بھی کفرانِ نعمت نہیں کیا۔ ظفر اقبال کا شعری مجموعہ ھے ھنومان اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ظفر استعارہ سازی کے عمل کو آرٹ فن اور ابلاغ کا لازمی جزو سمجھتے ہیں کیونکہ ھے ھنومان پورا مجموعہ ہی ہنومان کے دیومالائی کردار کو مختلف استعاروں میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ ظفر اقبال اپنے شعری مجموعے ھے ھنومان کے آغاز میں ''ہنومان جی اور ہم'' میں لکھتے ہیں کہ :

> ''ہنومان بنیادی طور پر بندر تھے چنانچہ میں نے اس کردار کو مختلف استعاروں میں متشکل کرتے ہوئے موجودہ عہد تک لانے کی کوشش کی ہے مثلاً اس کا پہلا استعارہ ڈرون کی متنازع تھیوری کے مطابق ہمارے آباؤاجداد کا بنتا ہے۔ اس کا دوسرا استعارہ دیومالا کا ہے۔۔۔اس کے علاوہ بندر ہوتے ہوئے یہ آدھے انسان کا استعارہ بھی ہے، بندر ایک محنت کش کا بھی استعارہ ہے کہ وہ ڈگڈگی پر ناچ کر اپنی روزی بھی کماتا ہے اور مداری کی بھی۔۔۔ایک عالم اور فلسفی کا بھی۔۔۔سفید فام اقوام کے حوالے سے نوآبادیاتی استبداد کا استعارہ بھی ہے۔ بندر بانٹ کے حوالے سے یہ قسامِ رزق کا استعارہ بھی بنتا ہے۔ جاگیردارانہ بالادستی کا بھی استعارہ بنتا ہے ۔۔۔ حتیٰ کہ کاندھے پر گرز رکھنے اور جنگل کا سردار ہونے کے ناتے یہ جنگل کے قانون یعنی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا استعارہ بھی ہے (گستاخی معاف) پھر بندر چونکہ ایک مثالی نقال بھی ہے اس لیے یہ عہد کے قینچی بردار شاعروں اور ادیبوں کا استعارہ بھی ہے علاوہ ازیں یہ اس ہنومان کا بھی استعارہ ہے جو سب کے باطن میں ظاہر اور مستور اور موجود ہے۔''(۶)

ظفر اقبال نے استعارے کی وساطت سے ایک کردار کو کئی کرداروں میں ڈھال دیا اور اپنے عہد کے معاشی، معاشرتی، سیاسی، ادبی مسائل کو ہنومان میں سمو کر سب کو آئینہ دکھلایا اور اظہار کی جدت کی بھی بنا ڈالی۔ ھے ھنومان کی استعاراتی تشکیل ظفر اقبال کی فنکاری اور زبان وبیان پر دسترس کی بھی عکاس ہے۔ ھے ھنومان کے حوالے سے ظفر اقبال کے رنگ بدلتے استعارے دیکھیے۔

؎ تاج ہے سر پر ہنومان کے
عجز ہے اندر ہنومان کے

؎ جنتا خاکی گوریلوں کی
ساتھ ہے اکثر ہنومان کے

؎ آدھا تو انسان بنے گا
بیٹھ برابر ہنومان کے

(ھے ہنومان، اب تک، جلد دوم، کلیاتِ ظفر اقبال، ص: ۱۰۲۱)

ہنومان کا کردار ان اشعار میں ہماری کلاسیکی شاعری میں غزل کے منبع یعنی قصیدے کے ممدوح کے کردار کو پیش کر رہا ہے۔ طاقت کی زبان خاکی گوریلے بھی سمجھتے ہیں اور باوردی یا خفیہ طور پر حکومت کی راہ میں اپنے مفادات کو منوانے والے سورما بھی برضا و رغبت طاقت کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

؎ بیٹھ کے چوٹی پر
کیجئے ٹیبل ٹاک

؎ ایک بندر یا سے
ہو گئے انٹر لاک

؎ بندر یاؤں میں سے
اچھی سی کوئی تاک

(ھے ہنومان، اب تک، جلد دوم، کلیاتِ ظفر اقبال، ص: ۱۰۲۳)

یہاں ہمیں ولی دکنی کی طرح کا عاشق نظر آتا ہے جو کسی ایک محبوب تک خود کو محدود نہیں کرتا بلکہ فطرت میں موجود حسن اس کے اندر محبت کے جذبے کو بیدار کیے رکھتا ہے اور وہ خوب سے خوب کی جستجو میں پیڑ در پیڑ گھومتا پھرتا نظر آتا ہے۔

؎ تاج کہاں سے پایا تم نے
کس کا گرز چُرایا تم نے

؎ ایک بندریا کی یادوں میں
اپنا آپ بھلایا تم نے

(ھے ھنومان، اب تک، جلد دوم، کلیاتِ ظفر اقبال، ص: ۱۰۳۷)

شاعر جدید جمہوری اور ملکی نظام پر بھی علامتی انداز میں نوحہ کناں ہے کہ تاج تو کسی اور کے سر پر ہونا چاہیے تھا لیکن جو بندر اس تاج کو پہنے ہوئے ہے دراصل اس کے پیچھے کوئی اور بیٹھا ڈوریں ہلا رہا ہے اسی لیے یہ تاج اس کے سر پر سجتا نہیں ہے۔ نوآبادیاتی ممالک میں اس طرح کے تجربات بین الاقوامی طاقتوں کے اشارے پر معمول بنتے چلے گئے جس سے تیسری دنیا کے معاشی طور پر کمزور ممالک ہمیں شکنجے میں جکڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یوں ظفر اقبال یہاں پر ہنومان کے سر پہ رکھے تاج کو غیر جمہوری طاقتوں کے استعارے کا روپ دیتے ہیں۔

؎ بندر جی سے ہوتے ہوتے
آئی شاعروں میں نقالی

؎ پیٹ میں چوہے دوڑتے ہیں
پھیلے گا بن میں طاعون

؎ ایک چھلانگ میں پہنچے ہیں
پیڑ کی چوٹی سے رنگون

؎ صاحب آخر صاحب ہے
ہنومان پہنیں پتلون

؎ ہنومان ہی کے یہ بھیس
کھوسے، پیر، ٹوانے، نُون

(ھے ھنومان، اب تک، جلد دوم، کلیاتِ ظفر اقبال، ص: ۱۱۱۰)

مابعد جدید عہد کا فرد جو انتشارِ ذات کے المیے کا شکار بھی ہے اور آباد کار طاقتیں جس طرح اس کو بے دست و پا کر کے یہاں سے راہِ فرار اختیار کر چکی ہیں اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال میں فرد کی مختلف حالتیں شاعر کے پیشِ نظر ہیں کہ پینٹ کوٹ میں ملبوس فرد کو وہ اقبال کی طرح وضع میں نصاریٰ یا تمدن میں ہنود تو نہیں دکھا رہے لیکن ظفر اقبال پینٹ کوٹ میں ملبوس شخص کے جسم پر اس لباس کو اجنبیت کا استعارہ بھی بنا رہے ہیں۔ دوسری طرف نو آبادیاتی عہد میں مراعات حاصل کرنے والے قبائل اور خاندان کا طنزیہ ذکر بھی ہمارے سیاسی نظام پر طنز ہے جو ہمیشہ کے الیکٹیبلز کی اچھل کود اور ایک پارٹی سے دوسری کی طرف چھلانگ لگا کے چلے جانے سے سارے سیاسی عمل کو مشکوک بنا ڈالتا ہے۔ کھوسے، پیر، ٹوانے اور نون یہاں محض خاندان یا سیاسی جماعتوں کی شناخت ہی نہیں ہے بلکہ لوٹا کریسی اور مفاد پرستی کی روش کو بھی سامنے لانے والے استعارے ہیں۔ ظفر اقبال نے ہنومان کو ایسا تخلیقی استعارہ بنایا جس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور عہد حاضر کے تمام مسائل اور معاملات کو ھے ھنومان میں بہت کامیابی سے سمو دیا۔ نسیم عباس لکھتے ہیں کہ:

> ''ظفر اقبال نے ''ھے ہنومان'' کے استعارے کو جو آفاقیت بخشی ہے وہ ان کی شعری روایت اور نئے پن کے امکانات کی عکاس ہے۔ اردو غزل میں استعارے کا استعمال کم و بیش تمام شعرا نے کیا ہے لیکن ایک استعارے کو مرکز بنا کر اس کے گرد معنوی دائروں کی تشکیل و تجسیم کے عمل کی وحدۂ لاشریک مثال ظفر اقبال ہیں۔''(۷)

ہنومان کے استعارے کی بحث بہت طویل ہے اور اس کے لیے ایک الگ تھیسز درکار ہے اس بحث کو شمس الرحمٰن فاروقی کی اس رائے کے ساتھ ختم کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ہنومان'' عمرو عیار کی زنبیل ہے، یا تھیٹر کا پردہ ہے جس میں سے شاعر اپنے مطلب کے موافق ہنومان جی کی دیومالائی شخصیت کی جگہ جدید انسان کی بہیمانہ، یا حریصانہ، یا زر پرستانہ یا جنس آلودہ یا استحصال کی چوٹ کھائی ہوئی مورت نکال کر ہمیں دکھاتا اور ہمیں شرمندہ کرتا ہے۔''(۸)

ہنومان انسان اور بندر، دیومالا اور حکایت سے لے کر جدید فرد کے استعارہ بنا دینے تک کے عمل میں ہم دیکھتے ہیں کہ پرت در پرت اس کی شخصیت کی تہہ داری اسرار و رموز سے بھری ہوئی ہے۔

سیاسی عمل میں شریک فرد، جمہوری حکومتوں کے تخت الٹ کر اپنی باوردی سپاہ کے ساتھ تخت نشین ہونے والا فرد یا ادارہ، روزی روٹی کے بکھیڑوں اور جھنجھٹ کا اسیر شخص اور بہر حال محبت کے مرض میں مبتلا عاشق یا شاعر کا استعارہ جو اول و آخر محبوب کے بازووں میں پناہ چاہتا ہے۔

۳۔ ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ: روایتی جہات

ظفر اقبال کی شاعری میں آبِ رواں سے شروع ہونے والا سفر ایک سنجیدہ اور روایت میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ روایت سے پیوست بھی تھا لیکن بعد میں گلافتاب کے نصف آخر اور رطب و یابس سے اینٹی غزل کے تجربات نے ان کی شاعری میں نئے ذائقے کو بھی شامل کیا اور روایتی مضامین اور تشبیہات و استعارات بھی نئی معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہوئے۔ دل جیسے پائمال موضوع و مضمون اور استعارہ و علامت میں بھی ظفر اقبال نے اپنی طبع کے مطابق جدت کے رنگوں کو سمونے کی سعی کی۔ ان کے معاصر ناقدین میں سے ایک اہم نام سراج منیر کا ہے جو ان کے جونیئرز میں بھی آتے ہیں لیکن اپنے مطالعے اور ادبی رائے کی وجہ سے اردو میں ایک معتبر مقام کے حامل بنے۔ سراج منیر نے اپنے ایک مضمون " یہ رنگ اک خواب کے لیے ہے" میں ستر کی دہائی کے شعرا کو " خواب" کے بنیادی استعارے سے جڑے ہوئے بتایا(۹)۔ جبکہ ناصر کاظمی کی نسل جو پچاس کی دہائی میں شاعری کر رہی تھی ان کے بنیادی استعارے کی کھوج میں اس کی جڑیں " یاد" سے جا ملائیں۔ راقم الحروف یہاں پچاس اور ستر کی دہائی کے درمیان موجود ساٹھ کی دہائی کے شعرا میں جب بنیادی استعارے کی کھوج کے لیے سرگرداں ہوا تو "دل " ایک ایسا بنیادی استعارہ نظر آیا جسے ساٹھ کی دہائی میں نئی معنویت کے ساتھ استعمال کیا گیا اور ان میں سب سے اہم ہمارے ممدوح شاعر ظفر اقبال ہی آتے ہیں جنھوں نے اپنی روایت سے پیوست اور روایت سے دور جاتی ہوئی دونوں طرح کی شاعری میں دل کو ایسے گوناگوں اور ہمہ جہت معانی میں برتا ہے کہ راقم الحروف کی ناقص رائے میں یہ دہائی پورے وثوق سے "دل" کے بنیادی استعارے سے موسوم کی جاسکتی ہے۔

ظفر اقبال کے پانچوں کلیات میں شامل ۳۲۶۷۰ اشعار میں وہ اشعار جو دل کے مضمون پر مبنی ہیں اور جن میں دل کا مضمون کئی استعاراتی رنگوں میں باندھا گیا ہے ایسے اشعار کی تعداد بھی ایک ہزار کے لگ بھگ ہے ۔

دل، ظفر اقبال کی غزل میں ان بنیادی موضوعات میں سے ہے جو آبِ رواں سے لیکر اب تک (کلیات غزل) جلد پنجم تک تواتر کے ساتھ آرہا ہے مگر یہ محض تکرار برائے تکرار نہیں ہے بلکہ دل کی وسعتوں کے در وا کرتی ہوئی تکرار ہے، گویا:

؎ اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

ظفر اقبال نے دل کو سو رنگوں میں سمو دیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ دل کی وسعت کائنات کی طرح لامحدود ہے۔ دل کی دنیا کئی رنگوں پر مشتمل ہے۔ کئی اطراف رکھتی ہے۔

دل کا پھیلاؤ ہی ایسا ہے کہ اس کا ہر وقت
ہوا ممکن کبھی صحرا، کبھی دریا لگنا

(تجاوز۔اب تک، جلد سوم، کلیاتِ ظفر اقبال، ص:۱۹۷۸)

یہ محض شاعرانہ بات نہیں ہے بلکہ درحقیقت دل کی وسعت صحراؤں، دریاؤں اور سمندروں سے کہیں بڑھ کر ظفر اقبال نے دکھلا دی ہے۔

بند ہی رہنا تھا اس بھیدوں بھرے دل کو ظفرؔ
یہ گرہ جو آج تک ہم سے نہیں کھولی گئی

(تادیب۔اب تک، جلد پنجم، کلیاتِ ظفر اقبال، ص: ۳۳۴۲)

ظفر اقبال یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ دل صرف ایک عضو نہیں بلکہ الگ کائنات ہے، انوکھی دنیا ہے پر اسرار، بھیدوں بھری دنیا جس کو مکمل تسخیر نہیں کیا جاسکتا ایسا دریا، سمندر ہے جس کی وسعت اور پایابی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، ایسا صحرا ہے جس کی خاک چھاننا ممکن نہیں۔ دل ظفر کے نزدیک ایک ایسا خلا ہے جس کی پیمائش نہیں کی جاسکتی اور بات صرف یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ خلا اندر خلا ہے دل ایک گورکھ دھندہ ہے ظفر اقبال کے نزدیک دل کہیں محبت کہیں گھر، کہیں جنون، کہیں کائنات، کہیں دریا صحرا، کہیں روحانیت، کہیں کربلا، کہیں صوفی، کہیں دنیا دار اور کہیں عہدِ حاضر کا انسان ہے۔

اردو غزل کی روایت میں دل کے استعارے کی بحث میں یہ بات بیان کر دی گئی ہے کہ اردو غزل میں دل، تمام غزل گو شعرا کا مرغوب موضوع رہا ہے اور یہ سلسلہ عہد حاضر بلکہ رہتی دنیا تک جاری و ساری رہے گا۔ تمام قابلِ ذکر شعرا نے دل کو بطور استعارہ برتا ہے مگر اس سلسلے میں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ زیادہ نمایاں ہیں کیونکہ انھوں نے دل کو یکسر نئے قالب میں ڈھال کر دل کو دلی، جذبہ اور عشق بنا دیا اس طرح تمام اہم غزل گو شعرا نے دل کو گھر، شہر، دریا، صحرا، دشت، گلشن، عشق، محبت، دکھ، کرب اور یاد کے استعاروں میں برتا اور یوں دل کے استعارے کی مختلف جہات بنتی چلی گئیں۔

ظفر اقبال نے بھی دل کو روایتی استعاروں میں بھی استعمال کیا مگر اپنے منفرد، اچھوتے اسلوب میں اور یوں روایت کو آگے بڑھایا اور غزل کا دامن کشادہ کیا۔ یہاں سب سے اہم سوال یہ اٹھتا ہے کہ ظفر اقبال کی وہ کون سی انفرادیت ہے جس نے دل کے استعارے کو جدید معنویت اور نئے معانی سے روشناس کروایا۔ سب سے اہم پہلو دل کے استعارے کو برتنے میں جو ان کے ہاں ہمیں کارفرما نظر آتا ہے وہ پہلی بار دل کو خلا کہنے سے ہے۔ یہ خلا مابعد جدید عہد میں پائی جانے والی مغائرت سے جنم لیتا ہے۔ جدید عہد کے فرد کا اجتماعیت سے ختم ہونے والا رشتہ اسے محفل میں بھی تنہا کر جاتا ہے اور وہ روایت کے گلدستے سے الگ ایک ایسے پھول کی طرح نظر آتا ہے جو خود نگر بھی اور مجید امجد کے اس شعر کی تصویر بھی پیش کر رہا ہے:

میرے مانند، خود نگر، تنہا
یہ صراحی میں پھول نرگس کا (مجید امجد، شبِ رفتہ)

طرفہ تماشا یہ کہ ظفر اقبال کے بیشتر اشعار میں دل کا مضمون باندھنے کے باوجود بھی یہ بھید وں بھرا دل ہنوز بند ہی ہے، بھید ہی ہے، پر اسرار بھید، اور یہ وہ گرہ ہے جو نہ وا ہوئی ہے، نہ ہونی ہے کیونکہ:

اپنے دل میں ہے ایک اور بھی دل
اس خلا میں ہے ایک اور خلا

(رطب ویابس، اب تک، جلد اول، کلیاتِ ظفر اقبال، ص: ۳۷۱)

ظفر اقبال کے روایتی استعاروں کے حوالے سے عہدِ حاضر کی معروف شاعرہ اور نقاد حمیدہ شاہین کہتی ہیں کہ :

> ''ظفر اقبال نے روایتی استعاروں کی نئے معانی کا لباس بھی پہنایا ہے لیکن یوں نہیں کہ ریشم و حریر کی جگہ پیوند لگا کھدر پہنا دیا ہو۔ بلکہ ایسا مناسب و موزوں اور خوش رنگ پیرہن دیا کہ سج گیا۔''(۱۰)

استعارہ سازی کے عمل میں استعارہ بنانا اتنا اہم نہیں سمجھا جاتا جتنا یہ کہ لفظ استعاراتی قالب میں ڈھلنے کے بعد جچتا ہے، وسعت معنی کا باعث بنتا ہے اور نئے معانی میں بودا، اور بے جا تو استعمال نہیں ہوا۔ اور اسے کس قدر قبولیت ملتی ہے۔ کیوں کہ بات اردو غزل کی روایت اور ظفر اقبال کے روایتی استعاروں کی ہو رہی ہے تو ظفر اقبال کی غزل میں دل کے استعارے کی چند اہم روایتی جہات کی پرتیں کھولتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ظفر اقبال نے روایت سے متاثر اور فیض یاب ہو کر دل کے روایتی استعارے کس طرح تشکیل دیے اور انھیں نئی معنویت سے روشناس کرایا۔

i۔ دل، گھر کا استعارہ:

گھر تہذیب و تمدن کی علامت ہے ۔گھر اور انسان کا ازل سے رشتہ ہے، گھر امن، تحفظ، پناہ، سکون، پیار محبت اور احساس ملکیت کا عکاس ہے۔ دل محبوب مجازی اور حقیقی گھر ہے۔ انسان نے اس وقت بھی غار، گھاس پھوس، لکڑی پتھر وغیرہ سے گھر بنایا جب وہ جنگل میں رہتا تھا اور آج بھی، جب شہری زندگی اس کی ترجیح ہے تو اب بھی روٹی، کپڑے کے بعد گھر ہی اس کی بنیادی ضرورت ہے۔ تبھی سیاسی جماعتوں نے بھی اس بنیادی ضرورت کی تکمیل اور دستیابی کی آس دلا کر لوگوں کو اپنی طرف مائل کیا اور یہ آواز لگائی کہ :

مانگ رہا ہے ہر انسان
روٹی، کپڑا اور مکان

میر تقی میرؔ نے کہا تھا

دل میں رہ دل میں کہ معمارِ قضا سے اب تک
ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا

خانۂ دل سے زینہار نہ جا
کوئی ایسے مکاں سے اُٹھتا ہے

یعنی گھر کی خواہش ہر انسان کے دل میں ازل سے ہے کیونکہ انسان امن پناہ، محبت کا متلاشی ہے۔ افتخار عارف نے کہا تھا۔

میرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کردے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کردے

افتخار عارف نے مکان پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ مکان کو گھر بنانے کی دعا مانگی اور کیوں نہ ہو کیوں کہ گھر ہی خاندان، آل اولاد، امن وامان، سکونِ قلب اور محبت کا گہوارہ ہے۔ اردو غزل میں گھر شاعری کا بنیادی موضوع ہے اور ہر شاعر نے اس موضوع پر اشعار کہے ہیں اور دل کو گھر کے استعارے کے طور پر بھی برتا ہے مگر ظفر اقبال کے ہاں دل گھر کے استعارے کے طور پر بہت برتا گیا اور خوب برتا گیا۔ دل اور گھر کیوں کہ بنیادی طور پر محبت کی عکاسی کرتے ہیں تو محبوبِ مجازی یا حقیقی کو ہر انسان اس گھر میں بسانا چاہتا ہے تاکہ گھر آباد ہو۔ دل کی ویرانی چھٹے اور چہل پہل ہو۔

خالی ہے دل کا یہ مکاں
آ، اس میں آبادی کر

(تساھل ،اب تك، جلد سوم، کلیاتِ ظفر اقبال، ص۲٦٦١)

ظفر اقبال دل کو گھر کے استعارے میں ڈھال کر اس کی آبادی کا خواہاں ہے کیونکہ خالی مکان کبھی گھر نہیں کہلاتا اور محبوب بن دل، دل نہیں۔ تہذیبی طور پر نئی بستیاں بسانے کے عمل کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کس طرح آبادی ہوتی ہے ظفر دل کو مجازی لبادہ خوب پہناتا ہے۔ اس شعر میں دل مستعار لہ، مکان مستعار منہ اور آبادی وجہ جامع ہے۔

گلی میں لوگ بھی تھے، میرے اُس کے دشمن لوگ
وہ سب پہ ہنستا ہوا میرے دل میں آیا ہے

(آبِ رواں،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص:۱۱۹)

آبِ رواں کے اس شعر میں ظفر عاشق کے دل کو گھر قرار دیتے ہوئے اس کی آبادی کی خواہش کی تکمیل کر رہے ہیں کیونکہ محبوب گلی میں دشمنوں پر طنز کرتا ہوا محبوب کے گھر میں آتا ہے اور دل کی دنیا آباد کرتا ہے جب بھی کسی لفظ کو استعاراتی یا مجازی معنوں میں استعمال کرتے ہیں تو اتنی مہارت سے کرتے ہیں کہ لفظ خود اپنے نئے معانی کی وضاحت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اور عقل قبولیت پہ مائل ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

> ''شعریات کا سب سے بڑا مسئلہ معنیات کے ذہنی جزو مد کے حسن کارانہ اظہار پر قدرت حاصل کرنا ہے۔ اظہار کے وسائل ان گنت ہیں لیکن ان میں جو مرکزیت استعارے کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے پیرائے کو نہیں۔''(۱۱)

ظفر اقبال معنیات کے اس جذ و مد پر مکمل عبور رکھتے ہیں اور استعارہ سازی پر فنی دسترس رکھتے ہیں۔

جس دل کو آج کنج اماں کہہ رہے ہیں لوگ
آسیبِ آرزو اسی اجڑے مکاں میں تھا۔

(آبِ رواں،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص:۷۹)

ظفر دل کو گھر متشکل کرتے ہوئے لوگوں کے مذہبی، معاشرتی رویوں پر نظر دوڑاتے ہیں کہ آسیب زدہ اجڑا مکان ہی ان کی پناہ گاہ بنا جو اس میں بسنے سے ڈرتے تھے۔ یہی حالت دل کی ہے، آسیب زدہ، ویران دل۔ اس شعر میں دل مستعار لہ، مکاں مستعار منہ اور کنج اماں وجہ جامع ہے۔

دل کی ویرانی کا منظر اس قدر کالا نہ تھا
فرش پر مٹی نہ تھی، دیوار پر جالا نہ تھا

(آبِ رواں،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص:۱۴۷)

ظفر دل کو گھر بنا کر اس کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دل ویراں بھی کبھی اتنا ویران اور اجڑا ہوا نہ تھا جتنا اب ہو گیا ہے۔ جیسے کوئی خالی، سنسان مکان، جس میں ہر طرف دھول مٹی اور جالے اُس کی کی بربادی کے عکاس ہوتے ہیں۔

ظفر دل سے نکل تو جائیں گے ہم
بہت یاد آئے گا یہ گھر پرانا

(گلا۔فتاب،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص:۱۸۰)

یہاں ظفر اقبال نے گھر اور ہجرت یا مسافرت کو دل سے ہجرت یا فراق کے آئینے ہیں دکھلایا اور دل کی مجازی صورت گری کی۔

اپنی خوشی سے آ یہاں، اپنی رضا سے جا
دروازہ میرے دل کا کھلا ہے تیرے لیے

(رطب ویابس ،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص:۳۸۶)

گھر کے دروازے ہر ایرے غیرے پروا نہیں ہوتے مگر ظفر اقبال نے اپنے محبوب کیلئے سب دروازے کھولے ہوئے ہیں کہ دل کا یہ گھر تیرے لیے ہے اور اس گھر کی رونق تیرے ہی دم قدم سے ہے۔

دل کے ہمسائے میں نکلو تو نظر آئیں گے
گھر کئی اور بھی تاریک پرانے، خالی

(غبار آلود سمتوں کا سراغ ،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص:۴۵۵)

جس طرح کسی بستی میں کئی پرانے، خالی گھر دکھائی دیتے اسی طرح دل کے گھر کے ہمسائے میں بھی یہی منظر ہے یعنی کئی دل ویران پڑے ہیں۔ برباد، اجاڑ گھروں کی صورت، جن میں کوئی ماہ رخ نہیں رہتا۔اس شعر میں دل مستعار لہ، گھر مستعار منہ، ہے اور ویرانی وجہ جامع ہے۔

سرنگ اس دل میں لگتی ہے کبھی اور
کبھی اس گھر کا تالا ٹوٹتا ہے

(عیب و ہنر ،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص:۷۳۳)

گھر میں چوری، ڈاکہ پڑتا ہے اور سبھی لٹ جاتا ہے۔ ظفر اقبال کہتے ہیں اسی طرح دل کا گھر بھی لٹ گیا اور ایسا بار ہا ہوا ظفر معاشرتی مسائل کی عکاسی کر رہے ہیں۔ اور دلی بے قراری کی بھی واردات محبت کی بھی کہ محبوب کیسے دل لوٹتے ہیں اس شعر میں ،دل مستعار لہ، گھر مستعار منہ، لٹنا وجہ جامع ہے۔ ظفر اقبال اتنے خوبصورت استعارے بناتے ہیں کہ دل عشق عش کر اٹھتا ہے اور یہی استعارہ سازی کا حُسن ہے کہ مجاز پر حقیقت کا گمان ہو۔

سووی اے برابر کسے بھونچال دی زد پر
اس دل دے سوا اپنا گھر بارای نشتے

(تحلیل ،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد چہارم، ص: ۲۵۱۱)

اردو میں پنجابی سرائیکی، پشتو، سندھی، وغیرہ کے پیوند لگانا ظفر اقبال کو خوب آتا ہے اور وہ یوں اردو اور علاقائی زبانوں کے فاصلے مٹانے کی سعی کرتے ہیں تاکہ اردو کو وسعت ملے اور تازگی بھی۔ اظہر غوری لکھتے ہیں کہ :

> ''بلاشبہ ظفر اقبال کی لسانی تشکیلات سے پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں سے نہ صرف اردو غزل کے روابط مستحکم ہوئے ہیں بلکہ اردو شاعری معاصر معنوی تشکیلات کے زیور سے بھی مزید آراستہ ہوئی ہے۔ مختلف زبانوں کے صحت مندانہ انضمام واد غام کا تسلسل ظفر اقبال کی مستحکم کردہ روایت کے ذریعے، یقین محکم ہے، کہ جاری و ساری رہے گا کہ اس طریق پر مختلف علاقائی اور لسانی ذائقے، اسالیب اور موڈز، جدت آمیزی اختیار کرتے، پنپتے اور نکھرتے چلے جاتے ہیں۔''(۱۲)

ظفر اقبال نے اس شعر میں بھی سرائیکی اور پشتو لفظ استعمال کیے ہیں اور تہذیبی و لسانی فاصلوں کو مٹانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ دل کو گھر کے استعاراتی معنی پہنائے ہیں اور اس دل یعنی گھر کے حوالے سے اپنی فکر اور وسوسوں کا بر ملا اظہار کیا ہے کہ میرا کل اثاثہ یہی ہے جو کہ بھونچال اور مصائب کی زد میں ہے اس کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ دل کو گھر کے خوبصورت پیکر میں ڈھالا ہے اور دل کو حقیقی کے بجائے مجازی پیکر عطا کیا ہے۔

دل کرائے پر ہی اُٹھ جائے کہیں، سوچتا ہوں
اس بڑھاپے میں کہیں سے تو کمائی آئے

(توسیع،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد پنجم، ص:۳۶۱۱)

اچھے شاعر کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جب بھی کسی لفظ کو شاعری میں استعمال کرتا ہے اور مسلسل کرتا ہے تو اس کے ممکنہ تمام پہلو سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے۔ ظفر اقبال نے دل کو گھر، مکان کے مجازی، معانی عطا کر کے گھر مکان کے تمام خصائص اور اطراف کو مد نظر رکھا۔ راقم الحروف نے جس کی چند شعری مثالیں پیش کی ہیں۔ گھر کا خالی، سونا پن، بنجر پن، گلی محلے کے لوگوں کے رویے، چوری، ڈاکہ، گھر چھننے کا خوف، آسیب، سایہ، جالے، ہجرت، گھر چھوڑنا، گھر کا بھونچال کی زد میں ہونا یا گھر، مکان کا کرائے پر دینا اور گزر بسر کرنا یہ سب متعلقاتِ گھر، مکان ہیں جن کو ظفر اقبال نے دلکش استعاراتی پیرائے میں استعمال کیا اور دل کو گھر بنا کر دکھایا۔ دل اور گھر کو یک رنگ کر دیا۔ ظفر اقبال کے ہاں دل بطور گھر کے استعارے پر اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر سب کا اندراج ممکن نہیں۔ دل بطور گھر کا استعارہ کی یہ بحث اس شعر پہ ختم کرتے ہیں۔

دل کے سب زخم ہیں بھرتے جاتے
گھر ہوا دار نہیں رہ گیا ہے

(توارد ،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد سوم، ص:۲۱۱۳)

(ii) دل، جنون، وحشت، محبت کا استعارہ:

محبت انسان کی سرشت میں رکھ دی گئی ہے۔ انسان کا لفظ اُنس سے نکلا ہے۔ دل معدن محبت ہے۔ محبت کا سرچشمہ دل ہے محبت کے بغیر دل ایک جسمانی عضو اور گوشت کے لوتھڑے کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔ شاعری لطیف جذبات کا نام اور جذبات کا تعلق دل سے ہے اور جذبات میں حسین ترین جذبہ محبت ہے۔

اک نظر، نصف نظر، شوخ نے ڈالی دل پر
اور اسدشت کو پیرایہء گلزار دیا

(غبار آلود سمتوں کا سراغ ،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص:۴۷۲)

محبت، عشق اور عشق جنون اور وحشت میں بدلتا ہے اور انسان بے خود ہو جاتا ہے عقل پر دل غلبہ پالیتا ہے۔ ہوش و حواس جاتے رہتے ہیں۔ اوائل محبت کی دیوانگی منہ تکتی رہ جاتی ہے۔ دل کا عالم ہی بدل جاتا ہے۔

جو پھُول کھلا زیر زمیں ہے مرے دل میں
وہ جب سے ہوا پردہ نشیں ہے مرے دل میں
نا چیز ہے صد مہرِ سلیماں مرے نزدیک
بلقیس کے ہونٹوں کا نگیں ہے مرے دل میں
آئے ہیں جسے شہر بدر کر کے یہ نادان
وہ شعلہء لب رنگ یہیں ہے مرے دل میں

(آبِ رواں اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص:۶۸)

محبت کے سوتے دل کی زمیں میں ہی پھوٹتے ہیں اور عاشقوں صادقوں کو لڑکپن، نوجوانی میں ہی چاند میں محبوب دکھائی دیتا ہے۔ دل کی زمیں میں محبت کے پھول کھلتے ہیں اور پھر تختِ سلیمان کی حیثیت کچھ نہیں رہتی، اتنی عظیم بادشاہت اور سلطنت کی طرف بھی دل مائل نہیں ہوتا بلکہ اس کے دل میں کسی بلقیس کا سکہ چلتا ہے۔ دنیا کی دولت، تخت تاج، لشکر، سپاہ، ہیرے جواہرات، بلقیس کے ہونٹوں کے لعل و یاقوت کے سامنے ہیچ دکھائی دیتے ہیں۔ ظفر اقبال کا مندرجہ بالا پہلا شعر یعنی مطلع محبت، دوسرا شعر، محبت سے اگلا قدم یعنی عشق کا اظہار ہے جبکہ تیسرا شعر، سرمستی اور جنون کا عکاس ہے۔

جب سے دل اندھا ہوا، آنکھیں کھلی رکھتا ہوں میں
اس پہ مرتا بھی ہوں، غافل بھی نہیں گھر بار سے

(رطب و یابس، اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص:۳۸۹)

ظفر اقبال کے اس شعر میں بھی دل محبت کی حد بندی میں ہے اور جنون کے عالم سے ہنوز دور ہے۔ مگر دل محبت میں اندھا ہو چکا ہے اب پیچھے ہٹنا محال ہے۔ دل پر جب محبت کا تیر چلتا ہے تو قرارِ

دل لٹ جاتا ہے۔ محبوب کی نظر دل کا شکار کرتی ہے۔ ہوش و حواس لوٹ لیتی ہے مگر اوائل میں دل و دماغ کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ اہل دل، دل کی ہی مانتے ہیں اور سب کچھ بنامِ محبت تج دیتے ہیں۔

نہ سہی اور کسی پر تو اجارہ اپنا
دلِ دیوانہ کو زنجیر تو کر سکتے تھے

(عیب و ہنر، اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص: ۶۴۶)

جب محبت دیوانگی اور جنون میں قدم رکھتی ہے۔ زنجیر کا موسم آتا ہے جو عاشقوں دیوانوں کا زیور ہے۔ زنجیر بذاتِ خود جنون اور بے خودی کی علامت ہے۔ اور اردو غزل کا روایتی موضوع ہے ڈاکٹر سعادت سعید رقمطراز ہیں کہ:

> ''اس امر سے پہلو تہی ممکن نہیں ہے کہ ہر عہد کے شاعروں کے ہاں کنایوں، استعاروں، اشاروں، اور علامتوں میں ماحول کے اتار چڑھاؤ کی داستانیں اپنے عناصر سمیت منعکس ہوئی ہیں۔ ظفر اقبال کی غزلوں میں اشارے، استعارے اور علامتیں معنوی اعتبار سے رواں اور متحرک ہیں۔''(۱۳)

ظفر اقبال کا شعر خود بولتا ہے اور اپنے استعاراتی بیان کی خود وضاحت کرتا ہے اور یہی استعارے کی خوبی ہے۔

دل پر کوئی قابو نہ رہا جب تو کسی طور
باندھا ہے یہ وحشی تری زنجیر سے ہم نے

(تشکیک، اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد چہارم، ص: ۳۱۰۱)

قابو میں ہی آتا نہیں تھا یہ دلِ وحشی
جکڑا اِسے آخر تری زنجیر سے ہم نے

(تادیب، اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص: ۳۳۴۵)

ظفر اقبال کے ان اشعار میں دل جنون اور وحشت کا استعارہ بن کر آتا ہے دل پر محبوب کے علاوہ کسی کا کوئی زور نہیں چلتا حتی کہ اپنا بھی۔ ظفر اقبال کے ہاں دل محبت، جنون کے استعارے کے طور پر بیشتر مقامات پر آیا ہے اور ظفر اقبال نے خوب نبھایا ہے۔

صحرائے دل میں خاک اڑاتی ہیں خواہش
ہر ذرہ اس دیار کا وحشت سرا ہوا

(آبِ رواں، اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص: ۱۰۱)

اردو غزل کی روایت میں صحرا، ویرانی، وحشت، جنون کی علامت ہے اور مجنون کا آخری پڑاؤ ہے۔ ظفر اقبال دل کو محبت، جنون اور وحشت کے استعارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جہاں خواہشوں نے خاک کی صورت دھارلی ہے اور وحشت پھیلی ہوئی ہے۔ دل بے آب وگیاہ صحرا کی صورت ہے جو محبوب کو بارش کی طرح ترستا ہے۔ جہاں کوئی روئیدگی، زندگی اور بہتری کی صورت دکھائی نہیں دیتی اور بھٹکنا مقدر ہے۔ یہی حال دل کا ہے۔ نا امیدی، بے یقینی، یہ سب متعلقات صحرا اور دشت ہیں اور اس میں بھٹکنا عاشقوں کی معراج ہے۔

محبت میں ناکامی پر ہر دل دشت، صحرا کی طرح ویران ہے اور عاشق مارا مارا پھرتا ہے۔ ظفر اقبال کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک لفظ کو کئی استعاروں میں ڈھالنے میں قدرت رکھتے ہیں۔ یہ ان کی فنی مہارت کی دلیل ہے۔ معید رشیدی لکھتے ہیں کہ:

> ''استعارہ نا ممکن کو ممکن بنانے کا نام ہے۔ خارجی یا روز مرہ کی دنیا میں کچھ کہہ کر کچھ مراد نہیں لی جاسکتی۔ یہ استعاراتی دنیا میں ممکن ہے۔''(۱۴)

یہی وجہ ہے کہ ظفر اقبال دل کو کئی قالب میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں اور نئے معانی متعین کرتے چلے جاتے ہیں اور وہ بھی اتنے دل آویز کہ دل کہتا ہے کہ اب حق ادا ہوا۔

سر میں رہتی ہے عجب طغیانی
دل میں اُٹھتے ہیں بھنور تیرے لیے

(تمجید، اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد سوم، ص: ۱۵۷۹)

ظفر اقبال نے روایتی مضامین میں جو تازگی پیدا کی ہے اور روایت کو وسعت بخشی ہے وہ لاجواب ہے۔ سید اذلان شاہ لکھتے ہیں کہ :

> ''ظفر اقبال حقیقی معنوں میں روایت کا دامن تھامے ہوئے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ یہ روایت وہ روایت ہر گز نہیں ہے جسکی کہنگی کا غم ہمیں پچھلی کئی دہائیوں سے کھائے جا رہا ہے بلکہ یہ روایت وہ روایت ہے جو خود ظفر اقبال نے ایک طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد قائم کی ہے۔ یہ اسی روایت کا کارنامہ ہے کہ وہ غزل جو مخصوص نقطے پر آکر ٹھہر گئی تھی اس کا ایک جنم ہوا ہے اور ہم اسے بالکل بدلے ہوئے نئے روپ میں دیکھ رہے ہیں۔''(۱۵)

ظفر اقبال نے روایتی مضامین اور استعاروں میں جو جدت اور بے ساختگی پیدا کی وہ دیدہ زیب بھی ہے اور قابل ستائش بھی۔

(iii) دل زندگی، کائنات کی وسعت کا استعارہ:

استعارہ سازی اظہار اور وسعت معانی کا ادبی ذریعہ ہے اور لفظ کے نئے امکانات پیدا کرتی ہے۔ ایک منجھا ہوا فنکار اس آرٹ سے بخوبی واقف ہوتا ہے اور ایک لفظ کو کئی استعاراتی اسلوب ، معانی اور قالب میں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ دل ، ظفر اقبال کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے اور ظفر اقبال نے دل کو اتنے خوش رنگ استعاروں میں برتا ہے کہ دل وسعت کے استعارہ کے طور پر ظفر کے ہاں بہت نمایاں ہے۔ جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ :

> ''یہ دل بظاہر ایک قطرہء خون ہے مگر بباطن ایک طوفان ہے۔ بظاہر چھوٹا سا گھر ہے مگر اس کی وسعتیں بے کراں اور بے نہایت ہیں۔ سارا عالم اس سے ، تنگ مکان میں گویا سمٹا ہوا ہے کسی وسیع صحرا کی طرح دل کی دنیا بھی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔''(۱۶)

یعنی دل ہی کو مرکزیت حاصل ہے۔ یہ دل ہی ہے جو اس کائنات کی تمام وسعتوں کو سموئے ہوئے ہے مگر اس کی وسعت کا اندازہ تمثیلی انداز میں لگایا جاسکتا ہے ویسے ہر گز نہیں۔ خواجہ میر درد نے کہا تھا:

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پاسکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

ظفر اقبال نے دل کو صحرا، سمندر اور کہیں دریا کے روپ میں ڈھال کر اس کی وسعت کا اظہار کیا ہے اور دل کے ظرف کی عکاسی کی ہے۔

دل تو بھرپور سمندر ہے ظفر کیا کیجئے
دو گھڑی بیٹھ کے رونے سے نبڑتا کیا ہے

(آبِ رواں، اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص: ۱۱۴)

ظفر اقبال اس دل کے تمام اسرار و رموز سے آگاہ ہے۔ اور شاید تبھی دل ان کی شاعری میں اس قدر آیا ہے اور وہ بھی سمندر، صحرا اور دریا کی وسعت کی طرح وسیع تر مفاہم اور استعاروں میں۔ ظفر کے نزدیک دل، سمندر، وسیع و عریض سمندر ہے اور دل رو رہا ہے تو دو گھڑی رونا اس کی طغیانی کیا کم کرے گا اس کیلئے صدیاں درکار ہیں۔

ظفر کے ہاں دل سے زیادہ وسعت کائنات میں اور کسی کو حاصل نہیں۔ سمندر، صحرا، دریا بھی اس کے سامنے ہیچ دکھائی دیتے ہیں۔ دل عجب خلقت ہے، عجب اسرارِ کائنات ہے۔ تبھی تو ظفر اقبال کہتا ہے:

دل کا پھیلاؤ ہی ایسا ہے کہ اس کا ہر وقت
ہوا ممکن کبھی صحرا، کبھی دریا لگنا

(تجاوز، اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اسوم، ص: ۱۹۷۸)

ظفر اقبال دل کے پھیلاؤ اور وسعت کو تمثیلی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر رقمطراز ہیں کہ:

"استعاراتی تمثالوں سے عبارت، شعر یا نظم پڑھتے ہوئے قاری، دو سطحی تجربے سے گزرتا ہے۔ وہ ایک سطح پر روزانہ کی حقیقی اور مانوس تجربات کی دنیا کا نئے

سرے سے تجربہ بھی کرتا ہے اور دوسری سطح پر ایک تخیلی اور نامانوس، معنیاتی فضا، بھی محسوس کرتا ہے۔"(۱۷)

کچھ بھرے دریاؤں میں بھی تھی نہ ایسی کیفیت
جو بھنور پیدا ہوئے ہیں اس دلِ پایاب میں

(آبِ رواں،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص۱۰۹)

دل، بھرپور دریاؤں سے بھی وسیع ہے جس میں بھنور در بھنور پڑتے ہیں۔ جو طغیانی پر ہے جس کی پایانی کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ جس کو بس تمثیلی انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے مگر حقیقت میں اس کی وسعت کا اندازہ لگانا کسی کے بس میں نہیں۔ دل میں محبت اور درد کی طغیانی ہے اور بے قراری کے بھنور ہیں۔

میں دل سے بھاگ کر جا بھی کہاں سکتا ہوں آخر
مرے ہر سُو یہ دشتِ بے اماں پھیلا ہوا ہے

(غبار آلود سمتوں کا سراغ ،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص:۴۷۹)

دل کی وسعت اور ویرانی و سنگلاخی دشت نما ہے۔ جو اک بار اس میں بھٹک گیا اس کا مقدر صدا بھٹکنا ہی ہے۔ کوئی بھی اس سے بھاگ کر جائے قرار نہیں پا سکتا۔ جو دل کی راہ لگا، وہ دشت و صحرا کے مسافر کی مانند ہے، جو صدا بھٹکتا ہی رہے گا۔ دل کے مسافر کی صحرا میں بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح کوئی منزل نہیں وہ بے موت مارا گیا۔

خیال اس کا بہت خوش ہے وسعتِ دل میں
ہمارے پاس یہ صحرا نشیں نہیں آتا

(غبار آلود سمتوں کا سراغ،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص:۴۷۴)

شومئ قسمت کہ خیالِ یار تو وسعتِ دل میں نہال ہے مگر وہ جو اس وسیع و عریض صحرا کا باسی ہے وہ اسے آباد نہیں کرتا۔ ظفر اقبال نے کمال انداز میں استعارہ استعمال کیا ہے دل کو صحرا قرار دیا اور پھر خیالِ محبوب کا اس صحرا میں آنا، خیال بذاتِ خود ایسی وسعت رکھتا ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں مگر

ظفر اقبال کہتے ہیں کہ اس دل کی وسعت دیکھیئے کہ خیالِ یار بھی اس میں خوش و خرم ہے۔ اس کی وسعت کی بنا پر ظفر اقبال نے روایتی مضامین میں نئے رنگ پیدا کر دیئے۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> ''غالبؔ اس لیے بڑا ہے کہ اس نے شاعری کو میرؔ سے آگے بڑھایا۔ چنانچہ میں اپنے آپ سے کبھی یہ سوال ضرور کروں گا بلکہ یہ سمجھوں گا کہ میں نے اگر شاعری کو غالب سے آگے نہیں بڑھایا تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔''(۱۸)

ہم ظفر اقبال کے روایتی استعاروں کی بات کر رہے ہیں۔ ظفر اقبال نے اس روایت میں جو اضافے کیے ہیں وہ قابلِ دید بھی ہیں اور قابلِ ذکر بھی اور یہ اضافے شعری وجدان کے ساتھ ساتھ ظفر اقبال کی شعوری کوشش بھی ہیں۔

دل میں اڑتے ہیں بگولے کیا کیا
کوئی صحرا ہے کہ بس دیکھتے جاؤ

(ترتیب،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد دوم، ص:۱۲۸۳)

دل وسیع، پھیلا ہوا، لا محدود صحرا ہے۔ جس میں ہر طرف بگولے اڑتے ہیں اور طوفان پڑتے ہیں۔ خواہشوں نے بگولوں کی صورت دھار لی ہے۔ دل میں بھی یادِ یار کی آندھیاں چلتی ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا:

> ''شاعری بنیادی طور پر استعاروں اور تمثالوں (images) کا معاملہ ہے۔ شعر میں تمثالیں محض تزئین کا ذریعہ نہیں ہوتیں بلکہ وہ وجدانی زبان کا جوہر ہوتی ہیں۔''(۱۹)

ظفر اقبال تمثال کاری اور تمثیلی استعاروں میں زبان کے ایسے جوہر شامل کرتے ہیں کہ شعر لفظیاتی، معنیاتی اور فنی سطح پر کمالِ حسن پر منتج ہو جاتا ہے اور قاری کو اک عجیب سحر میں گرفتار کر لیتا ہے۔ قاری پر تفہیم کے کئی در وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ظفر اقبال میں اچھے فنکار کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ محمد حسن عسکری لکھتے ہیں کہ:

"سائنس دانوں نے تو اب آکر ایٹم کو توڑنے کا طریقہ دریافت کیا ہے لیکن فنکار پہلے ہی دن سے یہی کر رہا ہے۔ وہ حقیقت کے جوہروں کو درہم برہم کر دیتا ہے تا کہ ایک نئی حقیقت کی تشکیل کر سکے۔"(۲۰)

ظفر اقبال نے دل کے ایٹم کو توڑ کر یہ دریافت کر لیا کہ اس جوہر میں اور کئی جوہر موجود ہیں اور اس حقیقت میں کئی اور حقائق پنہاں و پوشیدہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ظفر اقبال دل کو کئی قالب میں ڈھالنے میں کامیاب و کامران ٹھہرے۔

دل کا یہ دشت عرصہ ءمحشر لگا مجھے
میں کیا بلا ہوں، رات بہت ڈر لگا مجھے

(آبِ رواں، اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص:۱۱۶)

ظفر اقبال دل کو دشت کے استعارہ میں لیا اور دشت کو محشر قرار دیا یعنی استعارہ در استعارہ، دل کے دشت کی وسعت میدانِ حشر کی طرح ہے۔ جہاں سب کو اپنی پڑی ہوئی ہے۔ کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں ہے۔ نفسی نفسی کا عالم ہے۔ ظفر اقبال کے نزدیک دل کا بھی یہی عالم ہے اور میدانِ حشر جیسی وسعت ہے۔

ظفر اقبال دل کی وسعت کو کائنات کی وسعت سے عظیم تر جانتے ہیں اور تمثیلی انداز میں دل کو زمان و مکان سے وسیع تر دکھاتے ہیں اور شش جہات کو دل کے آگے کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ اور اس بات پر شاکی ہیں کہ دل کی کائنات کو آج تک کوئی مسخر نہیں کر سکا۔ جبکہ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں مسخر ہو چکی، ستاروں پر کمندیں ڈالی جا چکی، انسان نے چاند پر قدم رکھ دیا اور ستاروں پر زندگی کے آثار ڈھونڈ لیے مگر کسی نے اس عظیم کائناتِ دل کی جانب ہنوز توجہ نہیں کی۔

کتنے نا دیدہ مہ و مہر تھے میرے دل میں
یہی حسرت رہی ہے، کرتا کوئی تسخیر مجھے

(آبِ رواں، اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص:۱۲۰)

ظفر دل کو زمین و آسماں سے فروتر مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دل کی کائنات ہماری دیدہ دنیا سے کہیں وسیع و عریض ہے جس میں کئی جہاں اور دنیائیں، چاند ستارے موجود ہیں جن کی طرف کسی کی توجہ نہیں جاتی اور یہ سربستہ راز نہیں کھلتا۔ ظفر اقبال اس عہد کے شاعر ہیں اور دل کو اپنے عہد کی ترقی کے باوجود اک راز ہی گردانتے ہیں۔

دریافت ہوئیں دہر میں کیا کیا نہ زمینیں
اس دل کو مگر دعویٔ یکتائی وہی ہے

(آبِ رواں، اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص: ۱۴۳)

ظفر کہتے ہیں کہ کوئی ایسا نہ آیا جو اس زمینِ دل کی پیائش کرتا اس کی وسعت کو ماپتا۔

اپنے دل میں ہے ایک اور بھی دل
اس خلا میں ہے ایک اور خلا

(رطب و یابس، اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد اوّل، ص: ۳۷۱)

ظفر اقبال دل کو خلا اندر خلا کہتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس دل کے اندر بھی ایک دل ہے۔ سر بستہ، پر اسرار، غیر مسخر کائنات جیسا دل، جس کی وسعت اور امکانات کی کوئی حد نہیں۔ شاید قدرت کا سب سے بڑا راز انسانی دل ہی ہے۔

محمد حسن عسکری نے کہا تھا کہ:

"استعارہ، انسان اور کائنات کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔"(۲۱)

ظفر اقبال نے محمد حسن عسکری کی اس رائے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی اور انسانی دل کو کائنات میں مدغم کر دکھایا۔ استعارے کی وساطت سے اور اپنی ہنر مندی، شاعرانہ عظمت اور فنی دسترس منوائی۔ ظفر اقبال کی غزل میں دل کے استعارے کی کئی اور بھی روایتی جہات ہیں مگر وہ ان کی غزل میں سرسری آئی ہیں۔ مندرجہ بالا دل کے استعارے کی وہ روایتی جہات تھیں جو ظفر اقبال کی غزل

میں بار بار آئی ہیں اور ظفر اقبال نے روایت میں ایسے خوشنما اور خوش رنگ اضافے کیے ہیں جن کی خوشبو سے اردو غزل مہک رہی ہے اور معطر ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

جو پھُول باغ میں بے چین ہے دھڑکنے کو
تو میرے سینے میں دل بھی مہکنے والا ہے

(تنسیخ ،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد چہارم ص:۲۴۰۸)

الفاظ کا حیران کن استعمال اور لفظ کو نئے معانی سے آراستہ کرنا ظفر اقبال کا کمالِ فن ہے۔

آج کل خصلت بھی آپس میں ہے کیا بدلی ہوئی
دل مہکتا ہے شب و روز اور دھڑکتا پھول ہے

(تجاوز ،اب تک، کلیاتِ ظفر اقبال، جلد سوم، ص:۱۹۷۵)

ظفر اقبال کو کسی لفظ کو استعارے میں ڈھالنے میں وہ ملکہ حاصل ہے کہ جس کی معاصر اردو غزل میں شاید ہی کوئی مثال ملے۔

ظفر اقبال نے دل کے استعارے کو جدید معنویت اور نئے معانی سے روشناس کروایا۔ سب سے اہم پہلو دل کے استعارے کو برتنے میں جو ان کے ہاں ہمیں کارفرما نظر آتا ہے وہ پہلی بار دل کو خلا کہنا ہے۔ یہ خلا مابعد جدید عہد میں پائی جانے والی مغائرت سے جنم لیتا ہے۔ جدید عہد کے فرد کا اجتماعیت سے ختم ہونے والا رشتہ اسے محفل میں بھی تنہا کر جاتا ہے۔

ظفر اقبال کے ہاں روایت سے پیوست اور روایت سے منحرف دونوں طرح کے کلام میں دل بطور گھر، کائنات، وحشت یا جنون کے معانی میں آتا ہے تو اپنے ساتھ جدید سماج کی حسیات اور لوازمات کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے مسائل روایت سے جڑے ہوئے بھی ہیں اور اس سے کچھ مختلف بھی جو اس عہدِ انتشار اور پر آشوب وقت کی دین ہیں۔ مغائرت اور بیگانگی کے جس تجربے اور کرب سے جدید صنعتی عہد کا فرد گزر رہا ہے اس کا شمہ بھی روایت میں ہمیں نہیں ملتا کیوں کہ وہ اجتماعیت کا معاشرہ تھا اور جدید عہد کے فرد کے المیے کو اسی عہد کے حساس شاعروں اور ادیبوں نے بیان کیا جن میں ظفر اقبال اہم ناموں میں سرِ فہرست رکھے جا سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد ہادی حسین، زبان اور شاعری، مجلس ترقی ادب لاہور فروری ۱۹۸۴، ص: ۱۱۵

۲۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ، سنگ میل پبلی کیشنز ،لاہور، ۱۹۹۱، ص: ۱۳۱

۳۔ سید عامر سہیل ''گفتگو: ظفر اقبال کے ساتھ'' مشمولہ: انگارے کتابی سلسلہ نمبر ۴۸، دسمبر ۲۰۰۶ء، مرتبہ: سید عامر سہیل، گل گشت کالونی، ملتان، ص ۱۹

۴۔ ظفر اقبال، گلآفتاب، مشمولہ: اب تک، کلیات غزل، ظفر اقبال، جلد اول ، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۴، ص: ۲۸۵

۵۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، مغرب کے تنقیدی اصول، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء ص: ۷۵

۶۔ ظفر اقبال، ہنومان جی اور ہم ، مشمولہ: ھے ھنو مان، اب تک کلیات غزل جلد دوم ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور ۲۰۰۵ء ص: ۱۰۱۹، ۱۰۲۰،

۷۔ نسیم عباس ''ہنو مان ایک استعارہ'' مشمولہ: انگارے کتابی سلسلہ نمبر ۴۸، دسمبر ۲۰۰۶ء، مرتبہ: سید عامر سہیل، ظفر اقبال نمبر گل گشت کالونی، ملتان، ص: ۸۷

۸۔ شمس الرحمن فاروقی ''طبع رواں، منظر معنی، اور بے شمار امکان'' مشمولہ: اب تک، کلیات غزل، ظفر اقبال، جلد اول، ملٹی میڈیا افیئرز لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۵۷

۹۔ سراج منیر، "یہ رنگ اک خواب کے لیے ہے" مشمولہ: معاصر، شمارہ نمبر ۱، لاہور: ۱۹۷۹ء، ص: ۳۱۹

۱۰۔ حمیدہ شاہین ''اب تک'' مشمولہ: اب تک، کلیات غزل، ظفر اقبال، جلد چہارم، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور ۲۰۱۲ء، ص: ۲۸۸۴

۱۱۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ،سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ، سنگ میل پبلی کیشنز ،لاہور ۱۹۹۱ء، ص: ۱۲

۱۲۔ اظہر غوری، ''عرضِ ناشر''، مشمولہ: اب تک، کلیاتِ غزل ، ظفر اقبال، جلد چہارم ملٹی میڈیا افیئرز،لاہور، ۲۰۱۲ء، ص: ۳۱۵۹

۱۳۔ ڈاکٹر سعادت سعید'' خیال خلقی اور زبان انتظاری کی شاعری''مشمولہ: اب تک کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، جلد سوم،۲۰۰۶ء ملٹی میڈیا افیئرز،لاہور، ص: ۱۵۴۲

۱۴۔ معید رشیدی''استعارے کا بھید''مشمولہ:ذھن جدید، شمارہ نمبر۵۹، دسمبر ۲۰۱۰ء تا فروری ۲۰۱۱ء، ترتیب: زبیر رضوی، نئی دہلی، ص ۲۳

۱۵۔ سید اذلان شاہ''ظفر اقبال کا شعری وجدان''مشمولہ:نزول شمارہ نمبر۸، دسمبر ۲۰۱۳ء، ادارت: سید اذلان شاہ گوجرہ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ، ص: ۱۱۸

۱۶۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ولی سے اقبال تک، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۰، ص: ۴۷

۱۷۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر ،مجید امجد،شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص: ۱۰۷

۱۸۔ ظفر اقبال ''کمزور ہاضمہ اور انتظار حسین کی پھکی''مشمولہ: تلازمہ شمارہ نمبر۱، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۰ء، مدیران: حسنین سحر، کنور امتیاز احمد شاہد ماکلی، تلازمہ پبلشنگ گلبرگ، لاہور، ص ۲۲

۱۹۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی،مغرب کے تنقید اصول مقتدرہ قومی زبان ، پاکستان، ۲۰۱۲ ص: ۲۵۷

۲۰۔ محمد حسن عسکری، مجموعہ محمد حسن عسکری،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۴ء ص: ۹۸۰

۲۱۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔ص: ۲۰۰

باب چہارم

ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ: متنوع جہات

۱۔ **دل، روحانیت کا استعارہ:**

دل بمقابلہ دنیا۔۔۔ دل بطور چراغِ راہ، مرشد کامل۔۔۔ دل تجلیات کا استعارہ۔

۲۔ **دل کربلا کا استعارہ**

۳۔ **دل کی استعاراتی تجسیم کاری**

دل جدید حسّیت اور عصرِ حاضر کے انسان کا استعارہ:

عصری انسان کے معاشی، معاشرتی، سیاسی نفسیاتی، اخلاقی پہلو۔

ظفر اقبال اُردو کے ایسے جدید، شاعر ہیں جنھوں نے لسانی تشکیلات، نت نئے تجربات اور مقامی زبانوں کے الفاظ کی اردو میں پیوند کاری کر کے اردو غزل کے اسلوب اور مضامین کو وسعت بخشی اور غزل میں تازہ رُوح پھُونکی۔ لفظ کا ممکنہ استعمال اور نئے معانی کی تلاش اُن کی گھٹی میں شامل ہے۔ غزل کے نئے امکانات کی تلاش ان کے مزاج کا خاصہ ہے۔ ظفر اقبال اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> ''جدید غزل گو کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ کہتا کم اور چھُپا تا زیادہ ہے۔ اور اس طرح سے قاری کے لیے بہت کچھ خالی چھوڑ دیتا ہے اور یہی چیز اس کی شاعری کو دو جمع دو چار ہونے سے بچاتی اور معانی کے رقبے کو وسیع تر کرتی چلی جاتی ہے۔ دراصل تو ایک جدید غزل گو کا سب سے بڑا ہتھیار ایک بالکل غیر متوقع صورتِ حال پیدا کر دینا ہے، جو بجا طور پر اسے دوسروں سے مختلف اور ممتاز کرتی ہے۔''(۱)

ظفر اقبال نے غزل کے موضوعات کو وسعت دینے کے ساتھ اس کا اسلوب، لفظیات، لب و لہجہ اور رموز و علائم بدلنے کی جانب بھرپور توجہ دی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے اور اس جدت طرازی پر انھیں سخت تنقید کا بھی نشانہ بنایا گیا مگر وہ اپنی دُھن میں بڑی مستقل مزاجی سے جتے رہے اور اس بات کی قطعاً پروانہ کی کہ اس سے ان کی شعری ساکھ متاثر بھی ہو سکتی ہے اور وہ شہرت جو انھیں آبِ رواں کی اشاعت پر نصیب ہوئی۔ چھن سکتی ہے، اس حوالے سے ڈاکٹر ضیاء الحسن رقمطراز ہیں کہ:

> ''ظفر اقبال کم درجے کے قاری کی گرفت میں آنے والا شاعر نہیں ہے۔ اُس کی موضوعاتی وسعت اور فنی تجربات کا تنوع عام قاری کیلئے پریشان کن ہے۔۔۔ شاعر کا عہد اپنے مخصوص مزاج کے مطابق اسلوب کا تقاضا کرتا ہے اور نیا اسلوبیاتی تجربہ اس عہد سے زیادہ آنے والے ادوار کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر تک کی پوری شاعری کو ان کے عہد نے قبول نہیں کیا، اُن کے بہت سے تجربوں کو ان کے بعد کے ادوار نے دریافت کیا اور ان کی تحسین کی۔ ظفر اقبال کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ کوئی انھیں لسانی مسافتوں کا شاعر سمجھتا ہے، کوئی کرافٹ کا اور کوئی کلاسیکی اسلوب کا اور باقی سرمائے کو رطب و یابس۔ میرے خیال میں ان کے اس

''رطب و یابس'' پر آنے والے زمانوں کی نظر ہے اور ظفر اقبال کو اس بات کا احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر طرح کی مخالفانہ آرا کے با وصف مسلسل اپنے کام میں منہمک ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی مخالفانہ رائے کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ ظفر اقبال ہمارے عہد کے سب سے زندہ شاعر ہیں۔ وہ نہ صرف خود مسلسل زیرِ بحث رہے ہیں بلکہ انھوں نے غزل کو بھی ہمارے ادبی منظر نامے کا حصہ بنائے رکھا''(۲)

بلاشبہ ظفر اقبال مسلسل زیرِ بحث رہے اور ان پر موجودہ عہد میں بہت زیادہ لکھا گیا ڈاکٹر ضیاالحسن کی اس رائے (میرے خیال میں ان کے اس ''رطب و یابس'' پر آنے والے زمانوں کی نظر ہے اور ظفر اقبال کو اس بات کا احساس ہے) کی توثیق ظفر اقبال کے تنقیدی مضامین اور بیشتر انٹرویوز سے بھی ہوتی ہے۔ ایک مضمون میں ظفر اقبال لکھتے ہیں کہ:

''میں نے جو یہ کہہ رکھا ہے کہ مجھے مرنے کے پچاس سال بعد ''ایکسپلور'' ہونا ہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ آپکا عصر آپ کے بارے میں کبھی صحیح رائے نہیں دیتا، کیونکہ اس کے اپنے تعصبات، لحاظ داریاں اور مصلحتیں ہوتی ہیں، جو کسی کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں رکاوٹ بنتی ہیں''(۳)

بہر حال ظفر اقبال کا مقام و مرتبہ موجودہ یا آنے والا عہد جو بھی متعین کرے ایک بات طے شدہ ہے کہ وہ اس عہد کے اہم جدید شاعر ہیں اور اس جدت اور اہمیت کے پیچھے ان کی بے حد ریاضت شامل ہے۔ کسی بھی کام میں طے شدہ سانچوں کو توڑنا اور نئے اچھوتے انداز متعارف کرانا کوئی آسان کام نہیں ہے اور ادب میں تو یہ تبدیلی اس وقت تک کسی کو شرف قبولیت نہیں بخشتی جب تک قاری وفورِ تخلیق اور شعورِ تخلیق سے مجبور نہ ہو جائے، اور تخلیق اپنی جدت سمیت اتنی دلنشیں نہ ہو کہ دل میں اُتر جائے۔

ظفر اقبال نے جہاں اسالیب، معانی کی وسعت، الفاظ کے استعمال میں نئے کرشمے دکھائے وہاں انھوں نے دل کے مضمون اور دل کے استعاراتی اظہار میں بھی قوسِ قزح کے ایسے رنگ بکھیرے ہیں کہ جن کی شاید کوئی نظیر ملے، روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ ان میں جدت اور دل کے استعارے کی عصرِ حاضر کے تناظر میں متنوع جہات ظفر اقبال کے پانچوں کلیاتِ غزل میں اپنے رنگ

بکھیرے ہوئے ہیں اور اہلِ دل کے دل موہ لیتی ہیں اور ایسے سحر میں جکڑ لیتی ہیں کہ قاری کسی اور فضا میں چلا جاتا ہے۔

ظفر اقبال نے دل کے استعارے میں جو جدتیں پیدا کی ہیں اور دل کو عہد حاضر میں جن مفاہم میں استعمال کیا ہے ان کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ایک جدید شاعر روایتی مضامین اور استعاروں میں تازہ کاری کیسے پیدا کرتا ہے اور اپنے عہد سے انھیں کس طرح منسلک کرتا ہے اور نئے بیانیے کو جنم دیتا ہے۔

ا۔ دل، روحانیت کا استعارہ:

دل انسانی جسم کا مرکز و محور ہے اور جذبات اور محبت کی آماجگاہ ہے۔ لطیف جذبات اور احساسات درِ دل پر دستک دیتے ہیں۔ اردو غزل میں صوفی شعرا نے غزل میں دل کو تصوف، عرفان، عشق، روحانیت، فقر کے استعارے کے طور پر لیا۔ صوفی اور مائل پر تصوف شعرا کے نزدیک عشق اور عشق حقیقی تک پہنچنے کا راستہ بھی دل سے ہو کر گزرتا ہے۔ عقل و دانش کے مقابل دل اور وجدان کے مباحث بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ حقیقت تک رسائی کی راہ بھی دل سے ہو کر گزرتی ہے۔ جہاں عشق پُل کا کردار ادا کرتا ہے۔ عرفانِ حق کا پڑاؤ بھی دل میں ہے۔ میر تقی میرؔ نے عرفانِ دل کو بہت اہمیت دی ہے ان کے نزدیک سچے عرفان کیلئے دل کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

دل کا مطالعہ کرا ے آگہہ حقائق
ہیں فن عشق کے بھی مشکل بہت دقائق

(میر تقی میرؔ)

میرؔ کے نزدیک کتابِ دل سے فیض یاب ہوئے بغیر فن عشق میں تاک ہونا ناممکن ہے۔ میر جہاں مطالعہء دل کا سبق دیتے ہیں وہاں وہ دل کو نسخہء تصوف بھی قرار دیتے ہیں۔

دل عجب نسخۂ تصوف ہے
ہم نہ سمجھے بڑا تاسف ہے

(میر تقی میرؔ)

یعنی میرؔ کے نزدیک طریقت کا رہنما اور مرشدِ کامل دل ہی ہے۔ آئینہء حق دل ہے۔ دل تصوف کا سرچشمہ ہے۔ اسی دل سے عرفانی چشمے نکلتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں کہ :

> ''میرؔ نے دل کی برکات و فیوض کی بار بار تعریف کی ہے۔(اور یہ چیز صوفیانہ شاعری میں عام ہے) اس کیلئے انھوں نے طرح طرح کے شاعرانہ پیرائے اختیار کیے ہیں، کبھی کہا کہ دل طریقِ عشق کا رہنما ہے، کبھی اس کو قبلہ و پیغمبر قرار دیا کبھی اس کی تعریف میں یہاں تک بڑھے کہ اس کو خدا تک کہہ دیا۔
>
> طریقِ عشق میں ہے رہنما دل
> پیغمبر دل ہے، قبلہ دل، خدا دل۔''(۴)

میر تقی میر کے نزدیک سب کچھ دل ہی ہے حقیقت تک رسائی دل کے مرہونِ منت ہے۔

تمام صوفی شعراء اور تصوف کی طرف مائل شعرا نے دل کو مرکزِ تجلیات قرار دیا ہے۔ خواجہ میر دردؔ بڑے صوفی شاعر ہیں اور بذاتِ خود تکیہ نشین صوفی تھے۔ صوفیانہ خیالات اور مضامین ان کے غزلیہ کلام میں جا بجا پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ عظمت اللہ خان نے انھیں اردو میں صوفیانہ شاعری کا باوا آدم قرار دیا اور مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں لکھا کہ تصوف میں جیسا انھوں نے لکھا، اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔ خواجہ میر درد نے کہا تھا۔

پھوٹے گا اس زمیں میں بھی گلزارِ معرفت
میں یاں زمینِ شعر میں وہ تخم بو گیا

اور بالکل ایسا ہی ہوا۔ تصوف اور معرفت و عرفان اردو غزل کا اہم مضمون اور حوالہ بنا۔

ہر آن ہے واردات دل پر
آتا ہے یہ قافلہ کہاں سے

(خواجہ میر دردؔ)

نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر
جدھر دیکھتا ہوں وہی رو برو ہے

(خواجہ میر دردؔ)

خوجہ میر دردؔ کے نزدیک دل آئینہ بھی ہے اور شیش محل بھی۔ جہاں بس محبوبِ حقیقی کا عکس ہے۔

دل مرا باغِ دل کشا ہے مجھے
دیدہ ء جام جہاں نما ہے مجھے
ارض و سما کہاں تری وسعت کو پاسکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

(خواجہ میر دردؔ)

خالق حقیقی دل کے علاوہ کسی اور مقام میں نہیں سما سکتا یہی وہ جگہ ہے جہاں اس کا قیام ہے۔ خواجہ میر درد کے نزدیک دل وہ آئینہ ہے جس میں محبوب حقیقی جلوہ فرما ہے۔

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی، دیکھ لی

(خواجہ میر دردؔ)

اردو غزل کے مائل بر تصوف تمام شعراء، ولی، میر، خواجہ دردؔ، مظہر جانِ جاناں، آتش وغیرہ نے دل کو روحانیت اور عشق حقیقی سے متصوف کیا مگر ظفر اقبال جس عہد کے شاعر ہیں یہ مادی اور صنعتی عہد ہے، جدیدیت کا نعرہ ہے کہ خدا کی موت ہو گئی اور انسان نے جنم لیا۔ یوں خدا مرکزیت سے بشر مرکزیت کا آغاز ہوا۔ مذہب کی بازگشت ماند پڑنے لگی اور مادیت کا غلبہ ہوا مگر ظفر اقبال اس مادی عہد میں بھی انسان کی فطری جبلتوں اور عقل و دل، دین و دنیا، کی کشمکش کی عکاسی کرتے ہیں ظفر اقبال صوفی نہیں مگر ان کا رنگ صوفیانہ ہے۔ ظفر عہدِ حاضر کے انسان کی الجھنوں سے بے خبر نہیں ہیں۔ اقبال نے کہا تھا:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

(اقبال)

ظفر اقبال بھی یہ مانتے ہیں کہ اس صنعتی اور مشینی عہد میں انسان مادی اور روحانی کشمکش کا شکار ہے۔ وہ حقیقتِ دل سے بھی منہ نہیں موڑ سکتا اور وجدانی و روحانی جذبات سے بھی عاری نہیں ہو سکتا بلکہ وہ اس منجھدھار میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے اور سکون کا متلاشی ہے۔

(i) دل و دنیا کی کشمکش، دل بمقابلہ دنیا

ظفر اقبال کے ہاں روحانیت کے بڑے دائرے ہیں جو عصری آگہی کی بھی نمائندگی کرتے ہیں اور ظفر اقبال کے مشاہدے کے بھی عکاس ہیں۔

چیزوں کے درمیاں یہ رشتے عجیب ہیں
دل ہے تو اس کے ساتھ ہی دنیا ہے ساتھ ساتھ

(اطراف،اب تک، جلد دوم، ظفر اقبال، ص: ۹۲۳)

ظفر اقبال کے کلام میں دل و دنیا کی کشمکش ایک بڑا موضوع ہے۔ ظفر اقبال کے نزدیک دنیا اور دل متضاد چیزیں ہیں مگر یہ الگ ہونے کے باوجود بھی ایک ساتھ ہیں۔ کبھی دنیا حاوی آجاتی ہے اور کبھی دل، کیونکہ دل اور دنیا ساتھ ساتھ ہیں اور یہی عصرِ حاضر کے انسان کی مادی اور روحانی کشمکش ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پچھاڑنا چاہتے ہیں۔ ظفر اقبال دل کو روحانیت کے مفاہم میں استعمال کرتے ہیں اور کہیں دین مراد لیتے ہیں جبکہ دنیا مادیت پرستی اور بشر بیانیے کی نمائندہ ہے۔

آئینہ دل کا صاف کیا رہتا
اتنی گرد و غبار دنیا میں

(توارد،اب تک، جلد سوم، ظفر اقبال، ص: ۲۰۸۲)

دل صوفیا کے نزدیک آئینہ حق ہے مگر دنیا کی آلائشوں سے یہ آئینہ میلا ہو گیا ہے۔ روح پر دنیا غالب آتی جا رہی ہے اور انسان اس احساس سے یکسر عاری نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کو قرار نہیں مگر انسان اس دنیا میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔ اور آئینہء دل دھندلا ہوتا جا رہا ہے۔ روح بوجھل ہوتی جا رہی ہے۔

کہیں ایسا نہ ہو اندازہ ہی الٹا نکل آئے
جسے ہم دل سمجھتے آئے ہیں دنیا نکل آئے

(تشکیک،اب تک، جلد چہارم، ظفر اقبال، ص:۳۰۵۹)

یہاں دل جب استعاراتی قالب میں ڈھلتا ہے تو عضو نہیں بلکہ مذہب اور روح کہلاتا ہے۔

عہد حاضر میں اہل دنیا نے اہل دین کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے اور وہ دنیا کے حصول میں بھی دین کی بیساکھی استعمال کرتے ہیں اور اپنی دنیا سنوارتے ہیں مگر ظفر اقبال کے دل میں یہ احساس جاگزیں ہے اور دل پ،ر روح پر ، بھی دنیا کا گماں ہونے لگا ہے۔ کیونکہ دل کو قرار نہیں مل رہا اور اس میں خواہشات مادی پنپ رہی ہیں۔ روح کی سرشاری نہیں ہے بے یقینی کی کیفیت ہے جو الجھن کا باعث ہے

جسے دروازہ کہتے تھے وہی دیوار نکلی
جسے ہم دل سمجھتے تھے وہ دنیا ہو رہا ہے

(اطراف،اب تک، جلد دوم، ظفر اقبال، ص:۹۹۸)

صنعتی عہد کے انسان کی بے قراری دیدنی ہے اور ایک حساس شاعر جس کا مشاہدہ سطحی نہیں ہے وہ اس بے قراری کی عکاسی کر رہا ہے کہ روح پر مادیت غالب آرہی ہے اور اس عہد کا انسان دین سے، خدا سے دور ہوتا جارہا ہے۔ دین دار، پنڈت، صوفی، بھی دین کو دنیا کے حصول کا ذریعہ بنا چکے ہیں اور یُوں سب گڈمڈ ہو رہا ہے اور دل پر عقل و دنیا غالب آرہی ہے۔

دل و دنیا کا آپس میں
کیا ہے خود بٹوارا میں نے

(توارد،اب تک، جلد سوم، ظفر اقبال، ص:۲۲۰۱)

اس تیز رفتار دنیا میں جہاں سائنس کی حکمرانی ہے اور مذہب ، تصوف، علمِ عرفان، علم ادیان مخصوص مراکز تک محدود ہو رہا ہے مگر ظفر اقبال بیانگ دہل یہ اعلان کرتے ہیں کہ نہیں روحانیت ،دین ومذہب انسانی سرشت ہے اور اس کا خاتمہ ممکن نہیں اسے محدود کیا جاسکتا ہے مگر ختم

نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرا ظفر اقبال کے نزدیک دل اور دنیا ایک سکے کے دو روخ نہیں ہیں بلکہ دو متضاد حقیقتیں ہیں اور اس نے ان کا بٹوارا کر دیا ہے دونوں ساتھ ساتھ شاید چل تو سکتے ہیں لیکن کبھی بھی ایک نہیں ہو سکتے، ڈاکٹر افتخار بیگ لکھتے ہیں کہ:

> ''ظفر اقبال ذات کے ویرانے میں بھٹکتا ہے تو ایک کرب اور اضطراب اسے اپنی لپیٹ میں لیے رکھتا ہے۔ اس کی تخلیق اس کیلئے سُوہانِ رُوح بن جاتی ہے۔ وہ معروض کے انتشار و افتراق سے عاجز و درماندہ ہوتا ہے تو بار بار اپنے اندر کی دنیا میں پناہ ڈھونڈتا ہے مگر اندر ایک کہرام بپا ہوتا ہے۔ جذبوں کی اتھل پتھل اسے معروض کی طرف دھکیلتی ہے اور یوں ایک کشاکش جنم لیتی ہے۔ موصوف کی شاعری اس کشاکش سے عبارت ہے۔''(۵)

ڈاکٹر افتخار بیگ کے نزدیک بھی ظفر اقبال خارجی اور داخلی دنیا کی کشمکش کا شکار ہے یعنی عصرِ حاضر کا انسان نہ اس دنیا سے منہ موڑ سکتا ہے اور نہ دل و روح اور خدا سے بے نیاز ہو سکتا ہے اور یوں یہ دوبدو مقابلہ اور رسہ کشی جاری و ساری ہے۔

دونوں ہی لازم و ملزوم ہوئے
دل نہیں ہے تو یہ دنیا بھی نہیں

(وھم و گماں،اب تک، جلد دوم، ظفر اقبال، ص:۸۳۸)

ڈاکٹر ضیاالحسن نے کہا تھا کہ

جن کے بغیر جی نہیں سکتے تھے، جیتے ہیں
پس طے ہوا کہ لازم و ملزوم کچھ نہیں

مگر ظفر اقبال کے نزدیک دل و دنیا لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں دنیا ہے وہیں دل ہے اور جہاں دل ہے وہاں دنیا، دنیا مادیت، عقل پسندی، لادینی، مفاد پرستی، خود غرضی، خواہشات کی تسکین، لالچ، ظلم و استبداد کی عکاسی کرتی ہے جبکہ دل، پیار، محبت، بھلائی، ہمدردی، رحم دلی، انسیت، نیکی، خدا پرستی، دین داری، روحانیت، سکون و قرار، صبر و قناعت تسلیم و رضا اور فقر و درویشی کا استعارہ ہے۔ تبھی ظفر اقبال نے کہا تھا کہ

اب انتخاب ہے تیرا جسے بھی چاہے تُو
یہ دل ہے اور یہ دنیا بھی تیرے سامنے ہے

(ترتیب اب تک، جلد دوم، ظفر اقبال، ص: ۱۳۳۴)

ظفر اقبال نے دل اور دنیا کا واضح بٹوارا کر دیا ہے اور اس بات پر مصر ہیں کہ ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کیا جاسکتا ہے مگر یہ کوئی آسان انتخاب نہیں ہو سکتا، عہدِ حاضر کا انسان اتنا مجبور ہے کہ اس کیلئے کسی ایک سے بھی کنارہ کشی آسان امر نہیں۔

جاذب قریشی لکھتے ہیں کہ:

"ظفر اقبال کی شاعری میں جو اہم موضوعات اظہار پاتے ہیں ان میں تصوف، انسان، معاشرتی، جبر اور جمالیات کو نئی تازگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔"(۶)

جاذب قریشی کے نزدیک ظفر اقبال کے ہاں انسان، معاشرت، تصوف، جمالیات بڑے موضوعات ہیں۔ معاشرت، مادیت یا معاشرتی جبر کا تعلق دنیا اور تصوف و جمالیات کا دل وروح سے ہے۔ اب انسان ان دو پاٹوں میں پھنسا ہوا ہے مگر ظفر اقبال نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ:

اپنا دارومدار دل پر ہے
آپ کا انحصار دنیا پر

(توارد اب تک، جلد سوم، ظفر اقبال، ص ۲۰۸۳)

ظفر اقبال دل کو استعاراتی مفاہیم میں لیتے ہیں اور ان کے نزدیک دل خدا پرستی، نیک نیتی، سادگی، خوش اخلاقی، دین، روحانیت، تصوف اور بندہ پروری، درویشی و فقر واستغنا ہے۔ جس کے مقابل دنیا ہے جو مادیت، عقل پسندی، ومفاد پرستی، ظلم واستبداد، معاشی ناہمواری، حرص، لالچ، عدم مساوات، مکروفریب، معاشرتی تفاوت، ناانصافی، جاہ پرستی، بے دینی اور نمود و نمائش کا استعارہ ہے۔ ظفر اقبال کا عہد خدا مرکزیت سے بشر مرکزیت کا اعلان کر چکا ہے مگر ظفر اقبال خدا مرکزیت کی نمائندگی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور روح کی مرکزیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ظفر اقبال کی غزل کا مرکزی موضوع انسان ہے اور انسان بھی عہدِ حاضر اور عصرِ نو کا انسان جو اس مادی دنیا میں

قرار حاصل نہیں پا رہا، مارا مارا پھر رہا ہے، سب کچھ ہونے کے باوجود بھی جس کی روح بے قرار ہے۔ جس کے دل میں سکون نام کی کوئی چیز نہیں ہے مگر وہ دنیاوی آسائشوں کے ساتھ اپنے دل و رُوح کی دنیا بھی آباد دیکھنا چاہتا ہے۔

اس کے دل کے اندھیروں میں ایک اور زمانہ ہے
دنیا کے علاوہ بھی، دنیا تو نہیں سب کچھ

(تشکیل،اب تک، جلد سوم، ظفر اقبال، ص:۱۸۵۱)

ظفر اقبال با قاعدہ صوفی نہیں ہے مگر تصوف کا رنگ غالب ہے۔ وہ اس راز سے آگاہ ہے کہ حصولِ دنیا سب کچھ نہیں ہے اور نہ ہی یہ تخلیق آدم کی وجہ ہے بلکہ دل کی، من کی، روح کی دنیا کو تسخیر کرنا ضروری ہے جو کہ حقیقی کامیابی ہے۔ دل کی وسعت بے کراں ہے اور حققیت تک رسائی کی راہ ہے۔ عرفانِ ذات اور عرفانِ حقیقی دل کو مسخر کرنے سے ہی ممکن ہے اس کے سوا سب مایہ ہے مگر دل جو کہ روح ہے اس پر تاریکی کے بادل چھا چکے ہیں جن کے چھٹتے ہی ایک اور دنیا ہے جو بہت روشن، پر کیف اور مسرور کن ہے اور عصرِ حاضر کا انسان اسی دنیا کا متلاشی ہے اور اس کیلئے سر گرداں ہے۔ ظفر اقبال آبِ روں میں لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ جو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں نے اپنے لیے الگ بنائی ہے تو اس لیے کہ بعض وقت اپنا سر پھوڑنے کیلئے دور و نزدیک پتھر تک نہیں ملتا ضمناً می نے کچھ باتیں سمجھنے کی کوشش کی ہے،اور اکثر ناکام رہا ہوں، میری الجھن روحانی بھی ہے اور سیاسی بھی، جسے میں نے اپنی ذات کے حوالے سے حل کرنا چاہا۔ اور یہ ذات بجائے خود ایک بھرا پُرا چیستان نکلی''(۷)

ظفر اقبال عصرِ نو کے انسان کے نمائندہ بن کر اس عہد کے انسان کی ترجمانی کرتے ہیں اور اس کی روحانی اور سیاسی الجھنوں سے پردہ ہٹاتے ہیں۔ ظفر اقبال بتاتے ہیں کہ انسان روحانی اور دنیاوی مخمصے کا شکار ہے اور اس کی ذات عجیب قسم کی بیزاری اور بے دلی، بے قراری کا شکار ہے ۔روحانیواردات کا نمائندہ دل اور اس کے مقابل دنیا ظفر اقبال کے ہاں جدید تناظر میں بڑے

موضوعات بن کر ابھرے ہیں۔ اور ظفر اقبال نے روحانی اور دنیاوی کشمکش کو اپنی جدید غزل کا موضوع بنایا ہے۔

ii۔ دل بطورِ چراغِ راہ، رہنما، مرشدِ کامل

عقل و دل و عشق کی کشمکش ازل سے اہل دل اور اہلِ دنیا کے مباحث رہے ہیں، عقل، دنیا داری، مادیت پرستی، آسائشِ زندگی اور مفادات کی ترجمان ہے جبکہ دل، پیار محبت، روحانیت ، بھلائی، عبادت ، نور، روشنی، فقر، درویشی کا استعارہ ہے۔ اہل دنیا کی رہنما عقل ہے جبکہ اہل دین کا رہنما خود دل ہے۔ جو روح ہے، مرکز و محورِ تجلیاتِ خالقِ حقیقی ہے۔ عشق حقیقی کی آماج گاہ ہے۔ اقبال نے کہا تھا۔

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے
دل بیچارہ نہ زاہد ہے نہ ملّانہ حکیم

اقبالؔ

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اقبالؔ

عقل انسان کو دنیاوی مفادات کا سبق دیتی ہے اور اس دنیا کو مسخر و منور کرنے پر مائل کرتی ہے جبکہ دل ان دیکھی فضاؤں اور دنیاؤں کی راہ دکھاتا ہے۔ دل دنیا سے بیزاری اور فرار کا متلاشی ہے اور اہل تصوف اور جویائے حق کے لیے مرشد، رہبر، گرو، چراغِ راہ ہے۔ روحانیت کا سفر براستہ دل ہے۔

ساری فلاح، ساری فضیلت مجھے ملی
اس دل کے راستے سے گزرنے کے نام پر

(رطب و یابس،اب تک، جلد اول، ظفر اقبال، ص: ۳۳۵)

ظفر اقبال فلاح انسانی اور فضیلیت پانے کا واحد راستہ دل کو گردانتے ہیں اور کامیابی و کامرانی کا واحد راستہ جانتے ہیں جبکہ دوسرا راستہ عقل و دنیا کا ہے جس میں بہت چکا چوند اور کشش ہے مگر انجام تنہائی اور تاریکی ہے دل کا راستہ بہت مشکل، کٹھن، اور تنہا ہے مگر انجام سکون، قرار، اور وصالِ حق ہے۔ وصالِ حق، روزِ ازل سے انسانی سرشت ہے اور یہی چیز انسان کو تمام تر سہولیات اور آسائشات کے باوجود بھی بے قرار رکھتی ہے۔

گہری ہوئی جو شام تو روشن کیا ہے دل
پھر رات بھر یہ شمع جلی میرے ساتھ ساتھ

(تفاوت،اب تک، جلد دوم، ظفر اقبال، ص:۱۱۵۰)

زندگی کی تاریک راہوں میں دل انسان کے لیے واحد سہارا ہے۔ یہ دل ہی ہے جو یادِ حق میں سلگتا رہتا ہے اور انسانی زندگی کو مکمل تاریک نہیں ہونے دیتا۔ دن بھر انسان دنیا کے جھمیلوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ مگر رات کی تاریکی میں دل کا چراغ اس اس کے ساتھ جلتا ہے اور زندگی کیے جانے پر اکساتا بھی ہے اور انسانی ضمیر کو دن بھر کی کارستانیوں پر جھنجوڑتا بھی ہے۔ دل، مرشدِ کامل کی طرح انسان کو مائل بر ملال کرتا ہے اور اس کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور روشن راستہ اور حق کی راہ کا سبق دیتا ہے۔ گویا دل ایسا رہنما اور مرشدِ کامل ہے جو انسان کو بھٹکنے نہیں دیتا اور حق کی راہ دکھاتا ہے۔

طے کی ہے میرے دل سے ہی سب نے شبِ سفر
دیتا ہے روشنی یہ دیا اور دُور سے

(تنصیب،اب تک، جلد پنجم، ظفر اقبال، ص:۳۴۲۵)

زندگی کی تیرہ تاریک راہیں چراغِ دل کی رہنمائی میں ہی طے ہو سکتیں ہیں۔ یہ ایسا دیا ہے جو بھولے بھٹکوں کو راستہ بھی دکھاتا ہے اور منزل سے ہمکنار بھی کرتا ہے۔ ظفر دل کو استعاراتی معانی میں لیتے ہیں۔ استعارہ لفظ کو مفاہم عطا کرتا ہے اور بیان کو وسعت بخشتا ہے اور منزل سے ہمکنار بھی کرتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں کہ:

"ظفر اقبال کیلئے استعارہ ہمیشہ مکاشفہ اور توسیع ء معنی کیلئے آتا ہے۔ بعض اوقات تو ان کا استعارہ اس قدر بالواسطہ ہوتا ہے کہ فوری طور پر محسوس نہیں ہوتا۔ بیانیہ سطح پر شعر متاثر کرتا ہے جب غور کریں تو اس کے دوسرے ابعاد کھلتے ہیں۔"(۸)

شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق ظفر اقبال استعارے کو توسیع ء معنی کیلئے استعمال کرتے ہیں اور غور کرنے پر استعارہ اپنے آپ کو کھولتا ہے۔ محض سرسری مطالعہ کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ سرسری مطالعہ سے بسااوقات لفظ کے استعاراتی استعمال کی طرف توجہ ہی نہیں جاتی۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی اس رائے کا اطلاق بیشتر مقامات پر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ظفر اقبال ویسے بھی شعر میں زیادہ چھُپانے اور کم ظاہر کرنے کے قائل ہیں اس کا اظہار وہ اپنے کئی تنقیدی مضامین، کالم اور انٹرویوز میں بھی کر چکے ہیں۔

جل رہا ہے مرا دل بھی، مری آنکھیں بھی ظفرؔ
اس چکا چوند میں اب چاہیئے کیا اور چراغ

(ترتیب اب تک، جلد دوم، ظفر اقبال، ص: ۱۳۲۷)

ظفر اقبال کا یہ شعر دو آتشہ ہے اک طرف دل جل رہا ہے اور دوسری طرف آنکھیں۔ دل یادِ محبوب اور عشق میں سلگ رہا ہے جبکہ آنکھیں دنیاوی حسن سے خیرہ ہیں۔ نارسا حسرتوں میں آتش دان بنی ہوئی ہیں۔ انسان بے بسی کی تصویر بنا ہوا ہے۔ عجب کشمکش کا عالم ہے جو اس عہد کے انسان کا المیہ ہے۔ مایوسی منہ کھولے ہوئے ہے۔ دل داخلی کیفیات کا غماض ہے جبکہ آنکھیں خارج کی ترجمان۔ دل کی امنگ کچھ اور ہے اور آنکھوں کی ترنگ کوئی اور۔ ان دو طرح کی روشنیوں کے ہوتے ہوئے کسی اور کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

وہ روشنی ہے سفر میں کہ سوجھتا کچھ نہیں
سیاہی دل کی دکھاتی ہے راستا مجھ کو

(گلاً فتاب اب تک، جلد اول، ظفر اقبال، ص: ۲۳۱)

ظفر اقبال عصرِ نو کے انسان کی ان الجھنوں کا غماض ہے جو اسے چین نہیں لینے دیتیں۔ اک طرف جدید دنیا ہے اور اس کے فلسفے، سائنسی ترقی اور دولت و جاہ، عقل پسندی اور دوسری طرف انسانی فطری دینی، مذہبی، روحانی معاملات ہیں جو انسانی سرشت ہے اور انسان کے خمیر میں رکھ دیے گئے ہیں۔ انسان کو سمجھ نہیں آتی کہ وہ کس سمت جائے کس کو ترجیح دے۔ دین یا دنیا، روح و عشق یا عقل و دولت، دنیاوی چمک دمک یا آخرت، دنیا کے محل یا قبر کی منزلیں، خدائی پیغام یا دنیاوی فلسفے، ان تمام سوالات کو ظفر اقبال نے اپنی غزل میں دل کے استعاراتی استعمال میں اٹھایا ہے۔

مجھ کو بھی نا پسند ہے اس دل کی روشنی
یہ آخری چراغ بجھانے تو دے مجھے

(تفریق،اب تک، جلد پنجم، ظفر اقبال، ص: ۳۷۶۹)

ظفر اقبال دل کو انسانیت کیلئے آخری چراغ، آخری رہنما جانتے ہیں ساتھ ہی ساتھ وہ دنیاوی طنز و نشتر جو مسافران راہِ حق کو سہنے پڑتے ہیں ان سے بھی بے خبر نہیں ہیں۔ جب اکثریت اک سمت بھاگی جارہی ہو وہاں دوسری سمت اپنانا بہت کٹھن مرحلہ ہے تبھی ظفر اقبال کہتے ہیں کہ میرا دل کسی اور کیفیت میں ہے۔ اس پر کوئی اور واردات جارہی ہے یہ چراغ مجھے کسی اور منزل کی طرف راغب کر رہا ہے جبکہ دنیا اور سمت کھینچتی ہے تو جب تک یہ چراغ روشن ہے میرے لیے دنیا کے ساتھ چلنا آسان نہیں ہے تو کیوں نہ زمانے کی روش اپنالی جائے اور یہ چراغِ دل گل کر دیا جائے۔ یہ وہ عصری آگہی اور انسانی الجھنیں ہیں جنہیں ظفر اقبال دل کے استعارے میں ڈھال کر سامنے لاتے ہیں دل ایسا صوفی، مرشدِ کامل، رہبر، رہنما بن کر سامنے آتا ہے جو دنیاوی رہنماؤں، اہل علم و فلسفہ کے مقابل آتا ہے اور انسان کی رہنمائی کرتا ہے مگر اس عہد کا انسان فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ کس سمت جائے اور کس کی آواز پر لبیک کہے۔ دل یا دنیا روح یا مادیت!

iii۔ دل روحانی تجلیات کا استعارہ

دل جب مرشدِ کامل، رہبر، رہنما، چراغِ راہ بنتا ہے تو سالک کو روح کی وسیع و عریض اور ان دیکھی دنیاؤں کی سیر کراتا ہے جو انسانی معراج ہے اور گوہرِ مقصود ہے۔ دل اپنے سالک کو ایسی

وارداتِ عشق و عرفان سے آشنا کراتا ہے جو روح کو سرشار کر دیتی ہے اور پھر یہ دنیا اور اس کے تمام رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں اور انسان دنیا و مافیہا سے ماورا ہو جاتا ہے مگر یہ وارداتِ دل ہر کس و ناکس کی بساط میں نہیں ہے اس کے لیے مخصوص دل ہوتے ہیں جو با صفا اور پاکیزگی میں اعلیٰ وارفع ہوتے ہیں ۔جن دلوں میں میل کچیل اور کھوٹ نہیں ہوتا اور جو آئینے کی طرح صاف شفاف ہوتے ہیں۔ گو کہ یہ مرحلہ اہلِ تصوف اور اہلِ حق کیلئے مخصوص ہے اور ایک عام انسان ان لذتوں سے ناواقف ہے مگر ظفر اقبال اپنی غزل اور دل کے استعاراتی بیان میں ان منزلوں اور لذتوں کا ذکر کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اہلِ دل کو روحانیت کی طرف راغب کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ واردات خود ظفر اقبال کے دل پر گزری ہے۔ جس سے انھوں نے رزق شعر لیا۔

ظفر اک مشعلِ مہتاب گزری تھی کبھی دل سے
یہ شمعِ شعر میں نے جس کے شعلے سے فروزاں کی

(تواردِ اب تک، جلد سوم، ظفر اقبال، ص: ۲۱۹۱)

روحانی واردات یا تجلیء حق وہ نور ہے جس کو بیان کرنا انسانی دسترس میں نہیں ہے۔ بس اس کو محسوس کیا جاسکتا ہے اور سرشار ہوا جاسکتا ہے۔ ظفر اقبال کہتے ہیں کہ میرا دل اس تجلی سے فیضیاب ہے میں اس نُور کو دیکھ چکا ہوں اور میں نے یہ جو شاعری کا چراغ جلایا ہوا ہے میں نے اسی نورانی مشعل سے یہ چراغ روشن کیا ہے۔ اور یہ چراغ مسلسل روشن ہے۔ ظفر اقبال صوفی نہیں ورنہ یہ وارداتِ قلبی جاری و ساری رہتی وہ اس دنیا کے ایسے فرد ہیں جو روح اور روحانی معاملات کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور اسے انسانی فطرت گردانتے ہیں۔

اپنے عہد کے برعکس روح و قلب کو دنیا ہر ترجیح دینا اور توفیقِ تخلیقِ شعر کو بھی روحانی طاقت اور واردات قلب سے ہم آہنگ کرنا اس بات بات کا ثبوت ہے کہ وہ اس عہد میں، جب زمانہ خدا کی موت کا اعلان کر چکا ہے ظفر اقبال شعر تک کی تکمیل کو بشر کا کمال نہیں سمجھتے بلکہ خداداد توفیق مانتے ہیں اور خود کو خوش نصیب سمجھتے ہیں کہ میرا شعر کسبی نہیں بلکہ خداداد ہے۔ مشعلِ مہتاب کو مجازی معنوں میں بھی لیا جاسکتا ہے مگر جس طرح ظفر اقبال کے بیشتر اشعار دل روح کے استعارے کے ذیل

میں آئے ہیں اس سے اس بات کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے کہ اس مشعلِ مہتاب کو مجاز کے بجائے حقیقت کے آئینے میں دیکھا جائے اس بات کی توثیق ظفر اقبال کے اور اشعار سے بھی ہوتی ہے۔

کبھی دل پر گری تھی شبنم اسمِ محمد ﷺ
مری ہر سانس میں کلیوں کا مجموعہ کھلا ہے

(غبار آلود سمتوں کا سراغ،اب تک، جلد اول، ظفر اقبال، ص:۴۰۹)

شبنم کا تعلق رات بلکہ نصف شب کے بعد سے ہے اور یہ بات خواب کی جانب اشارہ کرتی ہے یعنی خواب میں نصیب جاگے اور محبوبِ حقیقی کی زیارت کا شرف ملا۔ دوسری چیز یہ کہ کلیوں کا کھلنا بھی صبح یا سحر سے مشروط ہے تو یہ شعر مکمل اشارہ کرتا ہے کہ دل پر روحانی واردات کا نزول ہوا اور محبوب حقیقی کے محبوب سے دل کی دنیا منور ہوئی اور دل میں اسی معطر پھول کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے اور وہی شبنم دل کی تسکین کا سبب ہے۔ اس ایک اسم کی برکت ہے جس نے سانسوں کو معطر کیا ہوا ہے منیر نیازی نے بھی کہا تھا۔

میں جو اک برباد ہوں آباد رکھتا ہے مجھے
دیر تک اسمِ محمد ﷺ شاد رکھتا ہے مجھے

(منیر نیازی)

دل میں اسم محمد ﷺ نقش ہونا بھی اہلِ حق کیلئے بذات خود تجلیء حق ہے۔ اس عہد میں جب دل میں دولت، بغض و حرص کے لات منات جا کر چکے ہوں تو دل میں اسم محمد ﷺ کی ٹھنڈک اور سانسوں میں اس کی مہکار بذات خود روح کی سرشاری کا باعث ہے اور انسان کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ محبوب کا دل میں آباد ہونا مسلسل دل کی غذا کا موجب ہے اور وصالِ حق پر دال ہے۔

ظفرؔ بلا سے وہ گردانتے نہیں دل کو
حریمِ خاص میں کچھ دن سے باریاب تو ہے

(غبار آلود سمتوں کا سراغ،اب تک، جلد اول، ظفر اقبال، ص:۴۶۰)

حریمِ خاص اس بات کا عکاس ہے کہ نظرِ کرم ہو چکی ہے۔ اس دربار میں باریابی ہی تو سب سے کٹھن اور مشکل مرحلہ ہے۔ باریابی ہو جائے تو پھر عنایت اور لطف و کرم یقینی ہے۔

بس ایک بار پڑا تھا اس آفتاب کا عکس
یہ دل یہ سنگِ سیہ، رات بھر چمکتا ہے

(غبار آلود سمتوں کا سراغ،اب تک، جلد اول، ظفر اقبال، ص:۴۲۳)

ظفر اقبال دل کو استعاراتی قالب میں ڈھالتے ہیں اور دل کو معانی کے مختلف لبادے پہناتے چلے جاتے ہیں جو اپنی جگہ خوش رنگ اور دل رُبا لگتے ہیں۔ دل جو سنگِ سیہ ہے، یاد رہے کہ حجرِ اسود بھی سنگِ سیہ ہے، رات بھر چمکتا ہے کیونکہ اس دل پر ایک بار بس اک بار عکس آفتاب پڑا اور اسے منور کر گیا۔ اب اس کی چمک دمک امر ہو چکی اور رات بھر یہ قمقموں کی مانند چمکتا ہے اور رات بھر چراغاں رہتا ہے۔ عمران اذفر ظفر اقبال کے حوالے سے کہتے ہیں کہ:

> ''معاملہ موضوعات کا ہو یا الفاظ کا، تشبیہ، استعارہ کے برتاؤ کا، وہ اپنے عہد کے مروجہ شعری ضابطوں سے الگ ہے۔''(9)

یقیناً ظفر اقبال موضوعاتِ شعر، استعارہ وغیرہ ہیں ایسی تازگی رکھتے ہیں جو قابلِ دید ہے اور جدید بھی۔ الفاظ کے استعمال اور ان سے نئے معانی کشید کرنا ان کا محبوب تخلیقی عمل ہے۔

دل میں جو ظفر، بند کیا تھا کبھی خود کو
میں آج تک اس غارِ حرا سے نہیں نکلا

(ترتیب،اب تک، جلد دوم، ظفر اقبال، ص:۱۲۹۸)

ظفر اقبال دل کو غارِ حرا کہتے ہیں۔ غارِ حرا ایسی نورانی جگہ ہے جہاں رسولِ اکرم ﷺ کو پہلی وحی ہوئی اور تجلیء حق کا پرتو پڑا۔ جبرائیل امینؑ نورانی پیکر میں وحیء حق لایا، تو ظفر اقبال دل کو غارِ حرا مان کر دل کو عضوِ انسانی و جسمانی سے ماورا سمجھتے ہوئے تجلیاتِ حق کی آماجگاہ مانتے ہیں۔

ظفر اقبال کے نزدیک دل تمام روحانی اور ماورائی واردات کا مرکز ہے۔ انسانی معراج کا سفر اسی دل کے توسط سے طے ہوتا ہے۔ تمام تر سلوک کی راہیں اسی دل سے گزرتی ہیں۔ یہ دل ہی ہے جو

وصالِ حق سے سرشار کرتا ہے۔ یہی وہ آئینہ ء باصفا ہے جس میں محبوب حقیقی کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ دل صوفی، درویش، قلندر، رہبر، رہنما، چراغِ راہ، مرشد کامل، تجلیات ء حق اور عرفانی کیفیات و روحانیت کا استعارہ ہے۔ تبھی ظفر اقبال نے کہا ہے۔

میں ہر سُو گونجتا پھرتا ہوں دل میں
کہاں تک اور اسے صحرائیے گا

(عیب وھنر۔اب تك، جلد اول، ظفر اقبال، ص:۱۵۷)

۲۔ دلکربلا کا استعارہ

تاریخِ انسانیت میں سانحہ ء کربلا کو نہایت نمایاں اور بلند مقام حاصل ہے۔ تاریخ ءاسلام میں بالخصوص کوئی قربانی اتنی اعلیٰ وارفع نہیں ہے جتنی امام عالی مقام حسینؑ ابن علیؑ اور ان کے جانثاران کی شہادت جو کربلا میں پیش کی گئی۔ خونِ حسینؑ نے ہمیشہ کیلئے حق و باطل کے درمیان ایک لکیر کھینچ دی اور کربلا، حق، ضمیر اور حریت کا استعارہ بن گیا۔ جگر گوشۂ رسول ﷺ نے کرب وبلا میں حق کا جو علم بلند کیا اور بے مثال قربانی پیش کی اس سے عالمِ اسلام کو اک نئی طاقت اور توانائی ملی اور شہید کا خونِ ناحق امر ہوگیا۔ جابر و ظالم حکمرانوں کا جاہ و جلال، سلطنت اور ارادے خاک میں مل گئے اور مظلوم کا خون صدیاں گزرنے کے باوجود اپنے نور سے اہلِ حق اور اہلِ حریت کو ضوفشاں کر رہا ہے۔ جب بھی حق و باطل کی بات ہو امامِ حسینؑ اور یزید کا کردار سامنے ہوتا ہے اور اہلِ حق حسینؑ ابنِ علیؑ کی طرح باطل کے سامنے سینہ سپر ہوتے ہیں۔ بچوں، بوڑھوں، غلاموں، جوانوں، خواتین، سب کیلئے کربلا ایسی درسگاہ ہے جس سے صدیاں گزرنے کے باوجود درسِ حق مل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس المناک داستانِ خاک وخون پر نہ صرف مسلم بلکہ اقوامِ عالم کے تمام مفکرین، ادباء اور شعرا نے سلامِ عقیدت پیش کیا۔ سید وحید الحسن ہاشمی نے بجا کہا کہ :

حدیثِ کرب و بلا ذہن سے نہ محو کرو
یہ ایک صفحۂ غم، عالمی ادب کا ہے

(وحید الحسن ہاشمی)

سانحہ کربلا پر اتنا لکھا گیا کہ مرثیہ صرف اور صرف کربلا سے منسوب ہو کر رہ گیا (جبکہ مرثیہ کسی کی موت پر اپنے جذبات کا شعری اظہار ہے)

مرثیہ کے علاوہ اردو غزل میں بھی واقعہ ءکربلا تخلیقی سطح پر ابھر کر سامنے آیا اور تخلیقی ،استعاراتی نئی معنویت کے طور پر برتا گیا اور اس سانحہ کے کئی ابعاد اور جہات بنتی چلی گئیں۔ گویا سانحہ ءکربلا اردو غزل میں مرکزی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اردو غزل سے کچھ مثالیں دیکھئیے۔

زیرِ شمشیرِ ستم میر تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیمِ محبت میں ہلایا نہ گیا
اس دشت میں اے سیل سنبھل ہی کے قدم رکھ
ہر سمت کو یاں دفن مری تشنہ لبی ہے

(میر تقی میر)

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کر اُٹھے
کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اٹھے

(مومنؔ)

لکھوں جو میں کوئی مضمون ظلمِ چرخ بریں
تو کربلا کی زمیں ہو مری غزل کی زمیں

(ذوق)

بلند ہیں علم آہ شورِ ماتم ہے
غمِ فراق سے گھر میں مرے محرم ہے

(ناسخؔ)

لالہ و گل ہیں زمیں پر تو فلک پر ہے شفق!
رنگ کیا کیا ہوئے خون شہدا سے پیدا

(آتشؔ)

جب بھی کبھی ضمیر کا سودا ہو دوستو
قائم رہو حسینؑ کے انکار کی طرح

(ظفر علی خاں)

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

(مولانا محمد علی جوہر)

حقیقت ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی
غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؑ، ابتدا ہے اسماعیلؑ

(اقبال)

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

(جوش)

خون شہید کا ترے آج ہے زیبِ داستاں
نعرہء انقلاب ہے ماتمِ رفتگاں نہیں

(فراق)

ڈوب کر پار اتر گیا اسلام
آپ کیا جانیں کربلا کیا ہے

(یاس یگانہ)

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

(فیض)

سلام اُن پر تہہِ تیغ بھی جنھوں نے کہا
جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تُو چاہے

(مجید امجد)

دل خوف میں ہے عالمِ فانی کو دیکھ کر
آتی ہے یاد موت کی پانی کو دیکھ کر

(منیر نیازی)

ایسا سبق پڑھا دیا اس نے کٹا کے سر ظفر
اہلِ زوال تھے سو ہم، اہلِ کمال ہو گئے

(ظفر اقبال)

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

(افتخار عارف)

تم ہی صدیوں سے یہ نہریں بند کرتے آئے ہو
مجھ کو لگتی ہے تمھاری شکل پہچانی ہوئی

(عرفان صدیقی)

چھلک اٹھا ہے کنارِ شفق سے تا بہ اُفق
ابد کنار ہوا خون رائیگاں نہ گیا

(ثروت حسین)

کتنے ہی زخم ہیں میرے اک زخم میں چھُپے
کتنے ہی تیر آنے لگے اک نشان پر

(شکیب جلالی)

ہماری تشنہ لبی کے تیور یہ کہہ رہے ہیں
ہمارے پاؤں پڑے گی موجِ فرات آخر

(محسن نقوی)

ہم عاشقان آلِ محمد ﷺ ہیں اے صباؔ
زندہ رہیں گے نام ہمارے فنا کے بعد

(صبا اکبر آبادی)

"چند غیر مسلم اردو شعرا کے اشعار دیکھیے:"

وہ دل ہو خاک، نہ ہو جس میں اہلِ بیت کا غم
وہ پھوٹے آنکھ جو روئی نہ ہو محرم میں

(رائے بہادر بابو ماتا دین)

نکلیں جو غمِ شہ میں وہ آنسو اچھے
برہم جو ہوں اس غم میں وہ گیسو اچھے

(پنڈت ایسری پرشاد)

تخصیص نہ ہندو کی نہ مسلم کی ہے اس میں
شبیرؑ کا پیغام جہاں بھر کیلئے ہے

(لالہ پرشاد گوہر)

اس کو کسی کتاب میں کرتے ہو کیا تلاش
ہر پاک دل پہ نقش کلامِ حسینؑ ہے

(منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی)

تڑپتے جو دیکھی ہیں لاشیں تو دل اب
ترے کوچے کو کربلا جانتا ہے

(مہاراجہ جسونت سنگھ پروانہ)

مندرجہ بالا غزلیہ اشعار سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ نہ صرف مرثیہ بلکہ اردو غزل بھی سانحہ ء کربلا کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اس عظیم قربانی کو مسلم، غیر مسلم اردو شعرا نے خراجِ عقیدت پیش کیا اور کربلا اور متعلقاتِ کرب وبلا کو غزل کا موضوع بنایا ہے۔ سانحہ ء کربلا بطور استعارہ اردو غزل کا ایک بڑا اور اہم موضوع بن چکا ہے ۔ ہجرت ، دربدری، بے گھری، پیاس، تشنگی، بے سروسامانی، شامِ غریباں، حق و باطل ، عشق، دل،، وفا، صحرا، دریا، نہر، فرات، ریت ، مٹی، آگ، خیمہ، تیر، سناں، تیر، تیغ، تلوار، طوق، طبل، لہو، دھواں، دشت ، پالان، مسافرت، نور، ظلمت، بغاوت، لشکر سپاہ، دشمن، اعدا، پانی، موج، آنسو، غبار، کارواں، علم، مشکیزہ، کنارہ، اور خاک و خون سب کربلا کے استعارے ہیں۔ اور متعلقاتِ کرب و بلا ہیں۔ کربلا اپنے اندر تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی، سیاسی اور تاریخی احوال کو بھی سموئے ہوئے ہے۔

عصرِ حاضر میں کربلا کا استعارہ اردو غزل میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ گوپی چند نارنگ رقمطراز ہیں کہ :

> ''موجودہ عہد میں نئے معنیاتی تقاضوں کے تحت شہادتِ حسینؑ کا تاریخی حوالہ رسمی رثائی ادب سے ہٹ کر عام اردو غزل اور نظم میں بھی پرورش پا رہا ہے اور پچھلی تین ، چار دہائیوں سے ایک نئے اظہاری اور شعری رجحان کی صورت اختیار کر رہا ہے، جو اپنی جگہ بے حد اہمیت اور معنویت کا حامل ہے۔''(10)

ویسے تو کربلا بطور شعری استعارہ کلاسیکی اردو غزل میں بھی موجود ہے لیکن جدید دور میں اردو غزل میں کربلا کی معنویت اور استعاراتی استعمال عصری صورتِ حال کی بدولت ہے۔ ظفر اقبال کا شعر دیکھیے۔

بجھا ہے رنگِ دل اور ،خواب ہستی کربلا ہے
کہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں، یہ کیسی کربلا ہے

(عیب وھنر،اب تک، جلد اول، ظفر اقبال، ص:۶۹۸)

ظفر اقبال عصری آگہی رکھنے والے شاعر ہیں ان کے نزدیک عصرِ حاضر کا انسان ظلم و ستم ، جرم وزیادتی، قتل وغارت خودکش حملوں، سیاسی جبر، مذہبی عدم رواداری، فسق وفجور، زباں بندی، منافقت، موقع پرستی، مکروفریب ،دھوکہ دہی، ابن الوقتی، شعبدہ بازی، عصمت دری، انسانی بے

توقیری و بے وقعتی، بغض، حرص، کینہ پروری اور سیاسی و سماجی ابتری اور استحصال کا شکار ہے۔ وہ چشم زدن میں صدیوں کا سفر طے کر کے دورِ حاضر کو سانحہ ء کربلا کے تناظر میں دیکھتے ہیں اور موجودہ حالات کا کربلا سے تال میل جوڑتے ہیں۔ ظفر اقبال اپنے ملک و قوم کے حالات سے دوسرے شعرا سے اس لیے بھی زیادہ با خبر ہیں کہ ان کا صحافتی مشاہدہ بھی ہے اور وہ با قاعدہ کالم نگار ہیں اور روزنامہ دنیا میں دال دلیا کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں اس طرح ان کا مشاہدہ دو آتشہ ہے۔ وہ ملک و قوم کی عصری صورت حال کا جائزہ بڑی باریک بینی سے لیتے ہیں اور تخلیقی سطح پر شعر میں ڈھالتے ہیں۔ دل بجھا ہوا ہے اور کربلا کا سامنا ہے مگر یہاں صورتِ حال دو چند ہے کہ اس عصری کربلا میں موت بھی نصیب نہیں۔ عہد حاضر کا انسان نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے بس موت وحیات کی کشمکش میں ہے۔

ظفر اقبال دورِ حاضر میں متضاد سمت کے مسافر ہیں۔ جب زمانہ مذہب، دین، دل و عشق، روحانیت کو خیر باد کہہ کر جدید سائنسی دنیا اور بشر بیانیے کی طرف لپک چکا ہے اور خدا اور مذہب سے اکتا گیا تو ظفر اقبال، خدا، رسول ﷺ، کتاب، دین، دل، عشق، تصوف اور روحانیت کے علمبردار بن کر سامنے آتے ہیں اور انسانیت کی فلاح اور بھلائی روحانیت میں دیکھتے ہیں۔ سانحہ ء کربلا داستانِ عشق و محبت ہے اور روحانیت کی معراج ہے۔ کربلا خدا، رسول ﷺ، دین، حق سے عشق، عبدیت، تسلیم و رضا، اطاعت، ایثار و قربانی اور انسانی سربلندی کی ایسی مثال ہے جس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ظفر اقبال سانحہ ء کربلا سے روحانی فیض حاصل کرتے ہوئے قافلہء عشق و مودت کے ہم سفر بنتے ہیں اور اسی جذبے اور عشق کو انسانیت کا شرف اور فلاح جانتے ہیں۔ دل کو کربلا کے استعارے کے طور پر باندھتے ہیں اور یوں دل کی معنویت کو کربلا کی معنویت میں ضم کر دیتے ہیں۔

ظفر اقبال کی رُوح، محبت و مودتِ محمد ﷺ و آلِ محمد ﷺ سے سرشار ہے اور اس محبت کا اظہار ان کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ظفر اقبال مذہبی، دینی، شاعری غزل کے پیرائے میں کرتے رہے ہیں۔ ظفر اقبال ادبیات، اسلام آباد، کے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں کہ: ''میں نے نظم، حمد، مرثیہ، اور نعت بھی لکھی ہے مگر غزل کے پیرایہ میں''[11]

اشعار کی صورت مودت کے نمونے دیکھیئے۔

جب سے مولا علیؑ کے گاؤں میں ہوں
چادرِ فاطمہ کی چھاؤں میں ہوں
جتنی اونچی بھی ہو مری پرواز
یہ سمجھ لے کہ تیرے پاؤں میں ہوں

(تادیب،اب تک، جلد پنجم، ظفر اقبال، ص:۳۳۱۹)

ظفر اقبال خود کو بابُ العلم کے گاؤں کا ایک فرد مانتے ہیں جس کو چادرِ فاطمہ زہراؑ کا سایہ نصیب ہے اور یہ شعری پرواز اور منزلت اس درِ اقدس کا فیض سمجھتے ہیں اور ان ہستیوں کی اطاعت اور تعظیم کو اپنے ہنر اور رزقِ شعر کا صلہ کہتے ہیں اور اپنی بلند پروازی کو پنجتن پاکؑ کے قدموں سے منسلک رہنے کی عطا جانتے ہیں۔ یہی وہ عقیدت ہے جو ظفر اقبال کے دل کو کربلا بناتی ہے اور وہ کربلا سے حق و صداقت، مہر و وفا کا درس لیتے ہیں۔

تیغِ جفا کے سامنے آپ ہی ڈھال ہو گئے
ایسی مثال پیش کی، ایک مثال ہو گئے
رک نہ سکی گرے ہوئے سرخ لہو کی روشنی
شامِ غروب ہو کے وہ صبح جمال ہو گئے
رسمِ وفا تو سر بسر آپؑ کے گھر سے ہی چلی
جس کا شروع تھے کبھی، اس کا مآل ہو گئے
کب سے دلِ فسردہ میں موجِ فرات اٹھی نہیں
کتنی ہی عمر جھڑ گئی، کتنے ہی سال ہو گئے
نامِ حسینؑ لے کے جب اٹھنے لگا زمیں سے میں
بوجھ مرے وجود کے سب پرو بال ہو گئے
ایسا سبق پڑھا دیا اس نے کٹا کے سر، ظفرؔ
اہلِ زوال تھے سو ہم اہلِ کمال ہو گئے

(وھم و گماں،اب تک، جلد دوم، ظفر اقبال، ص:۸۸۸)

امام حسینؑ سے محبت کی ٹھنڈک ہر اہل دل محسوس کرتا ہے اور امامِ عالی مقام کو ہر باضمیر شخص سلامِ محبت و عقیدت پیش کرتا ہے۔ تو ظفر اقبال جو عہد حاضر میں دل اور روحانیت کی طرف انسانیت کو مائل کر رہے ہیں وہ کیسے اپنے دل کو کربلا میں نہ محسوس کریں۔ دل ظفر اقبال کے ہاں جہاں مختلف استعاروں میں اپنی نیرنگیاں دکھاتا ہے وہ دل ظفر اقبال کے ہاں کربلا کے معنی و مفاہیم میں بھی سامنے آتا ہے۔ ظفر اقبال کے ہاں ، تیغ ، تیر تلوار، ڈھال،لہو،رسمِ وفا، موجِ فرات، سر، علم، دشت ،خاک، اکسیر،بغاوت، دریائے گریہ،آنسو، دریا،صحرا،کارواں،موج،موجِ خوں، ریت، شامِ غریبی وغیرہ سب کربلائی استعارے اور متعلقاتِ سانحہء کرب وبلا ہیں۔ یہ الفاظ اس بات پر دال ہیں کہ شاعر کربلا کے تناظر میں استعاراتی فضا بناتا ہے۔ ظفر اقبال کی غزل میں کربلا کے مناظر اور تلازمات بکثرت ہائے جاتے ہیں۔ استعاراتی اور علامتی پیرائے کے حوالے سے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ :

> ''استعاراتی اور علامتی پیرایوں کی (اگر انھیں فنکار نے سلیقے سے برتا ہے تو) سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ الفاظ صرف منطقی رشتوں تک محدود نہیں رہتے بلکہ تعلیقات اور تلازموں کے ذریعے متحرک بھی کرتے ہیں اور پورے بیان کو برقیا(Energise) دیتے ہیں۔ نتیجتاً معنیات کی ایسی تنظیم وجود میں آتی ہے جو تہ در تہ اور کثیر الابعاد ہوتی ہے اور الفاظ کی چھپی ہوئی قوتوں کو بروئے کار لاتی ہے۔ اس کا دارومدار بڑی حد تک شاعر کی انفرادی صلاحیت اور تخلیقی قوت پر ہے۔۔۔استعاراتی اظہار کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر اسے تخلیقی رچاؤ اور گہرے احساس سے برتا جائے تو اس کے امکانات لامحدود ہو جاتے ہیں۔ اس کے گوناگوں مفاہیم کا احاطہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ معلوم ہے کہ استعارہ قطعیت کی ضد ہے۔ اس کا نقطہء آغاز ٹھوس حقیقت ہی ہے لیکن سچی شعری کارفرمائی کے بعد معنیاتی امکانات کی اتنی جہات پیدا ہو جاتی ہیں کہ ان کا قطعی بیان ممکن نہیں۔''(12)

ظفر اقبال، گوپی چند نارنگ کی اس رائے پر پورا اترتے ہیں کیونکہ ظفر اقبال کا خاصہ ہے کہ وہ الفاظ کے ممکنہ استعمال اور اس میں نئی معنویت پیدا کرنے میں کمال رکھتے ہیں اور یہی کمال انھیں جدید شاعر بناتا ہے۔

زبان، لفظ ان کے شعر میں کلیدی اہمیت کا حامل ہے اور لفظ سے نئے معانی اور مفاہم کی تلاش ان کا محبوب فن ہے۔ استعارے کے مباحث میں بھی سب سے اہم بات یہی ہے کہ لفظ سے نئے معانی کشید کیے جائیں اور لفظ حقیقی کے بجائے مجازی معانوں میں استعمال کیا جائے۔ ظفر اقبال اس فن میں اس قدر تاک ہیں کہ وہ ایک لفظ کو کئی استعاروں میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں دل کے استعارے کی بحث ہو رہی ہے تو دل کو انھوں نے کہیں گھر، کہیں عشق و جنوں، کہیں وسعتِ زندگی، کہیں روحانیت و تصوف، کہیں کرب و بلا اور کہیں عصرِ حاضر کے انسان کے استعارے کے طور پر برتا اور دل کو نئے معانی و مفاہم سے مزین کیا۔

ظفر اقبال دل کو کربلا کے استعارے کی ذیل میں استعمال کرتے ہیں تو دکھ، درد، کرب، حزن و ملال، محبت، عقید تو مودت اور آلِ رسول ﷺ کے غم کا عنصر نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ کربلا ان کی روح کو گھائل کر چکی ہے اور یہ غم اور ملال ان کے شعروں میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔

وہ یہ غم کبھی اپنے عہد کے تناظر میں دیکھتے ہیں اور کبھی اپنی روح کے آئینے میں بیان کرتے ہیں۔ کربلا ان کے داخل و خارج کی ترجمان ہے۔

حدیثِ شامِ غریبی شجر شجر سے کہو
جو دل پہ بیت رہی ہے زمانے بھر سے کہو

(سرِ عام، اب تک، جلد اول، ظفر اقبال، ص: ۵۶۵)

دس محرم کی شام، شامِ غریباں کہلاتی ہے اور یہ ایسی بھیانک شام تھی جب خانوادہ ءرسول ﷺ کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا، سادانیوں کا لٹا پٹا قافلہ یہ رات کرب و بلا کے خونی صحرا میں گزارنے پر مجبور تھا ہر طرف آلِ رسول ﷺ اور جاں نثارانِ حسینؑ کی لاشیں، جلے ہوئے خیمے، سسکتے ہوئے بچے، آہیں بھرتی مائیں تھیں جبکہ دوسری طرف یزیدی لشکر میں فتح و کامرانی کے شادیانے بج رہے تھے۔ خدا جانے یہ منظر چشمِ فلک نے کیسے دیکھا ہو گا۔ آلِ رسول ﷺ سے محبت و عقیدت ہر مسلمان اور کربلا سے الفت ہر باضمیر انسان رکھتا ہے۔ انسانی دل اس سانحے پر صدیوں سے مغموم چلا آرہا ہے۔ اور آنکھیں اشک بہاتی آرہی ہیں۔ ظفر اقبال کہتے ہیں کہ کربلا کی یہ داستان ہر

صاحبِ دل تک پہنچنی چاہیے کہ کس طرح ظلم و ستم کی داستان رقم کی گئی اور نہتے، مٹھی بھر اہل بیت رسول ﷺ کو بے دردی سے شہید کر کے ان کے اہل و عیال کو قیدی بنا کر اہل حکم کے دربار لایا گیا ۔ ظفر اقبال کے ہاں دل یہاں دو معنویت پیدا کر رہا ہے ایک دل کربلا کا استعارہ ہے جبکہ دوسرا درد و غم کا مرکز۔ دل یعنی کربلا میں جو اہل بیت رسول ﷺ پر بیتی وہ داستانِ غم و الم زمانے بھر کو بتائی جائے تا کہ حق اور باطل آشکارا ہو۔

دوسرا ظفر اقبال کربلا کو اپنے عہد کے تناظر میں دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرے وطن کا حال بھی کربلا جیسا ہے۔ یہاں بھی اہل حکم، ظلم و جور روا رکھے ہوئے ہیں اور یہاں ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ ناانصافی دیدنی ہے۔ یہاں کا ہر دن یوم عاشورہ اور ہر شام، شامِ غریباں ہے تو ان حالات پر خاموشی اختیار کرنے کے بجائے کربلا والوں کی طرح مزاحمت کی جائے۔ نعرہء حق بلند کیا جائے۔

ہوا تھا دل سے بلند اک علم بغاوت کا
میرے حساب میں شورش وہی کہیں سے ہوئی

(تنصیب،اب تک، جلد پنجم، ظفر اقبال، ص:۳۴۰۸)

امامِ عالی مقام نے کربلا میں یزیدیت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور جابر، ظالم اور فاسق حکمران کے سامنے عزم و ہمت کا پہاڑ بن کر کھڑے ہو گئے۔ سر کٹانا تو پسند کیا لیکن اسلام کے نام پر ظلم و جبر کی حکومت کے سامنے سر جھکانا پسند نہیں کیا۔ نواسۂ رسول ﷺ کی شہادت نے اسلام کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا اور عالمِ اسلام میں کرب وبلا کے بعد ایسی شورش اٹھی جو صدیوں پر محیط ہے۔ کربلا کے بعد بھی اموی، زبیری، ثقفی، عباسی اور ہاشمی بر سرِ پیکار رہے حتی کہ مسلمانوں سے خلافت کا منصب بھی چھن گیا۔ اسلامی اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ امام حسینؑ نے اہل حق کو ظلم و جبر کے سامنے ڈٹ جانے کا ایسا سبق دیا جو آج تک جاری و ساری ہے۔ کچھ مفاد پرستوں نے کربلا کے نام پر اور انتقامِ حسینؑ کے نام پر اپنے سیاسی عزائم کی آبیاری بھی کی۔ ظفر اقبال خونِ حسین کے معاشرتی، ثقافی اور تاریخی اثرات سے بے خبر نہیں ہیں اور وہ اس سانحے کو آج کے ملکی حالات کی سنگینی کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ خیر و شر، حق و باطل کی یہ قوتیں آج بھی بر سرِ پیکار ہیں اور شاید قیامت تک دونوں

ساتھ ساتھ چلتی رہیں گی۔ مگر عصرِ حاضر کے انسان نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کس کے ساتھ ہے کس کی آواز پر لبیک کہنا ہے امامِ حسینؑ یا یزید، حق یا باطل، دین یا دنیا، خیر یا شر، عمران اذفر لکھتے ہیں کہ:

"ظفر اقبال کے ہاں پیکر اور استعارہ دونوں مجرد سے محسوس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں بے چینی، انفرادی و اجتماعی انتشار، ذہنی خلفشار، رائیگانی کا جو احساس معاشرتی و اجتماعی سطح پر نیپ رہا ہے اس کا گہرا شعور شاعر کے ہاں ملتا ہے"(۱۳)

ظفر اقبال کے شعر میں شعور کی یہ رو بڑی واضح اور اہمیت کو حامل ہے۔ ایک حساس فنکار جو محسوس کرتا ہے اس کو اپنے شعر میں ڈھالتا ہے اور یوں معاشرے کی عمومی صورتِ حال کی عکاسی بھی کرتا ہے اور جو اس کے محسوسات ہیں وہ بھی عیاں ہو جاتے ہیں۔ ظفر اقبال کربلا کو اپنے عہد سے ہم آہنگ کر کے بھی دیکھتے ہیں اور اس سانحے پر جو اُن کی داخلی کیفیات ہیں ان کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

نظر آتا نہ تھا اس بار دل کے دشت میں کچھ بھی
غبارِ کارواں تھا، کارواں کی دوسری جانب

(تجاوز، اب تک، جلد سوم، ظفر اقبال، ص:۲۰۱۵)

کرب و بلا سنگلاخ، بے آب و گیاہ صحرا تھا۔ جس میں کاروانِ حسینؑ نے پڑاؤ کیا اور یہ مٹھی بھر کا رواں ہزاروں پر بھاری پڑ گیا۔ تین دن کی پیاسی سپاہِ خُدا نے دشتِ کربلا میں عزم و شجاعت کی ایسی داستان رقم کی جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جذبہء شوقِ شہادت سے سرشار یہ جانثارانِ دینِ اسلام کا قافلہ جب میدانِ کارزار میں حملہ آور ہوتا تو دشمن یوں بھاگتا جیسے بھیڑ بکریوں پر شیر حملہ آور ہوتا ہے۔ صحرا میں ہر سمت گرد و غبار اڑتا دکھائی دیتا۔ غبار، دشت، کارواں سب متعلقات کرب و بلا ہیں۔

کیا ریت کا اک پھول سا کھل اٹھتا ہے دل میں
جب موج ہوا آتی ہے صحرا کی طرف سے

(اطراف، اب تک، جلد دوم، ظفر اقبال، ص:۹۲۷)

کرب و بلا میں ہر طرف ریت ہی ریت تھی اور قافلہء حسینی پر پانی کی بندش نے اس ریت کی معنویت میں اور اضافہ کر دیا ہے اس ریت میں پھول چہرے ہمیشہ کیلئے ریت اوڑھ کر سو گئے اور

انسانیت کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ جہاں کربلا درد و غم، حزن وملال، اشک وآنسو سے منسلک ہے وہاں انسانیت کیلئے پیغام اور حوصلہ بخشنے والی بھی ہے۔

انسانیت کی ڈھارس بھی بندھاتی ہے کہ بسا اوقات موت کو گلے لگا کر بھی جنگ جیتی جا سکتی ہے۔ ویسے بھی خونِ شہید انسانیت کو تقویت بخشتا ہے۔ ریت کو دیکھ کر اور صحرائی ہوا کربلا کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ اور دل میں کربلا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور یہ یاد غم کے ساتھ شہدائے حق کی جرات و جواں مردی پر دل میں کئی پھول کھل جاتے ہے۔ اور ان پھولوں کی یاد تازہ کر جاتی ہے جو اس بے آب وگیاہ، لق ودق صحرا میں دس محرم کو کھلے اور پھر کبھی نہیں مرجھائے، ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کی تازگی اور شگفتگی میں نکھار پیدا ہوتا گیا اور جب تک انسانیت کا ضمیر زندہ ہے وہ ان پھولوں سے معطر رہے گی۔ بقول فیض احمد فیض:

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو جانی آنی ہے ، اس جان کو کوئی بات نہیں

شہیدوں کی للکار کبھی مانند نہیں پڑتی اور جواں مردی سے جان قربان کرنا انسان کو کبھی مرنے نہیں دیتا بلکہ حقیقی زندگی بخشتا ہے۔

رُک نہ سکی گرے ہوئے سرخ لہو کی روشنی
شامِ غروب ہو کے وہ صبح جمال ہو گئے
کب سے دل فسردہ میں موجِ فرات اٹھی نہیں
کتنی ہی عمر جھڑ گئی، کتنے ہی سال ہو گئے
ایسا سبق پڑھا دیا اس نے کٹا کے سر ظفرؔ
اہل زواں تھے سو ہم اہل کمال ہوئے

(وھم و گماں،اب تک، جلد دوم، ظفر اقبال، ص:۸۸۸)

ظفر اقبال کہتے ہیں کہ امامِ عالی مقام کا خونِ نا حق انسانیت کو روشن کر گیا اور وہ مقتول ہو کر بھی قاتل پر سبقت لے گئے، امر ہو گئے۔ مگر کربلا والوں کے بعد کوئی ایسا نہ آیا جو انسانیت کو سر خرو

کرتا اور ظلم و جبر کے سماج کے سامنے کربلا بپا کرتا۔ سانحہ ء کربلا کے بعد کربلا میں فرات کی موجوں میں بھی وہ دم خم نہیں رہا کیونکہ حسینؑ پیاسے رہ گئے، گویا فرات بھی امام حسینؑ کے سامنے شرمسار ہے اور کوئی مابعد کربلا تاریخی عالم میں ایسا انسان نہیں آیا جو امام حسینؑ کی طرح انسانیت کو معراج بخشتا۔ امام حسینؑ نے سر کٹا دیا مگر انسانیت کو کمال بخش گئے۔ ہم پیروکارِ حسینؑ ان پر فخر کرتے ہیں کیونکہ انھوں نے ہمیں زوال سے اوجِ کمال تک پہنچا دیا۔

ساکت ہیں آسمان و زمیں اور دم بہ خُود
اس دل کی خاک پر یہ تیری پاؤں دھرنیاں

(ترمیم۔اب تک، جلد پنجم، ظفر اقبال، ص:۳۹۱۵)

کربلا کی خاک کو یہ شرف حاصل ہے کہ فرزندِ رسول ﷺ، جگر گوشہ ء علی و بتولؑ امام حسینؑ اور اہل بیت رسول ﷺ نے اس زمین کو شرف بخشا اور یہ خاک خونِ حسینؑ ملنے کے بعد خاک شفا بن گئی اور کربلا، کربلائے معلیٰ بن گیا۔ امام حسینؑ اور ان کے اصحاب نے کربلا میں مہر و وفا کی جو داستان رقم کی اس پر زمین و آسماں حیرت زدہ ہیں چشم فلک نے ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا جو نواسۂ رسول ﷺ نے کارنامہ سرانجام دیا اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

دل کے ظفر اوصاف کھلیں گے اسی صورت
یہ خاک اگر لائیں گے اکسیر کے آگے

(توسیع۔اب تک، جلد پنجم، ظفر اقبال، ص:۳۵۳۶)

ظفر اقبال دل کو کربلا جانتے ہیں دل ان کے ہاں کربلا کا استعارہ ہے ویسے بھی کربلا کا دل و روح سے گہرا رشتہ ہے۔ کربلا کی اہمیت اہل دل اور باضمیر لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ظفر اقبال کہتے ہیں کہ کربلا کے اوصاف بیان کرنا ممکن نہیں ہے اور نہ یہ انسانی فہم میں سما سکتی ہے۔ خاکِ کرب و بلا میں خون حسینؑ شامل ہے اور خاک خاک شفا بن چکی ہے۔ اس خاک کے مقابل اکسیر بھی کوئی چیز نہیں ہے۔

ظفر اقبال نے دل کو استعاراتی پیکر میں ڈھال کر اس لفظ کو ایسے مفاہم سے آشنا کر دیا ہے اور اتنی وسعت بخش دی ہے جس کی تعریف کیے بنا دل کو قرار نہیں آتا۔ دل ظفر اقبال کے ہاں کربلا کا استعارہ ہے جو داخلی دنیا اور خارجی دنیا میں بیک وقت سفر کرتا ہے اور انسانیت کو مسخر کرتا چلا جاتا ہے۔ دل کربلا ہے اور ظفر اقبال کے نزدیک کربلا، عشق و محبت حریت، مہر و وفا، عزم و شجاعت حزن و ملال، معراجِ انسانیت، تسلیم و رضا، کا استعارہ ہے۔ ظفر اقبال کے اس شعر کے ساتھ دل کربلا کا استعارہ کے مباحث کا اختتام کرتے ہیں۔

آنسوؤں کے زور میں بھی شعلہء دل ہے بلند
جل رہا ہے، یہ دیا، برسات میں رکھا ہوا

(تشکیک،اب تک، جلد چہارم، ظفر اقبال، ص:۳۰۹۷)

۳۔ دل کی استعاراتی تجسیم کاری

(دل، جدید حسّیت اور عصر حاضر کے انسان کا استعارہ)

ظفر اقبال قیامِ پاکستان کے بعد ۶۰ کی دہائی میں منظر عام پر آنے والے اہم جدید غزل گو شاعر ہیں۔ اب تک کے عنوان سے ان کے (۵) پانچ کلیاتِ غزل منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ہر کلیات میں ۶ مجموعے شامل ہیں۔ جبکہ چھٹے کلیات کے بھی دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں یُوں میدانِ غزل میں میر تقی میر کے علاوہ کوئی بھی غزل گو شاعر مقدار اور ضخامت کے اعتبار سے ان کے مقابل نہیں ٹھہرتا۔ موضوعات کا تنوع اور رنگا رنگی ان کے ہاں بہت پائی جاتی ہے۔ شاید کوئی ایسا موضوع ہو جس کو ظفر اقبال نے اپنے شعر میں نہ ڈھالا ہو، مگر ان کی غزل کا بنیادی اور مرکزی موضوع انسان ہے۔ جدید حسیت اور عصرِ حاضر کا انسان ان کے تمام موضوعات میں کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔

ڈاکٹر سعادت سعید ظفر اقبال کے حوالے سے اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں کہ:

> ''ظفر اقبال کی غزل کا بنیادی موضوع انسان اور اس کے حوالے کی عکاسی ہے۔ انھوں نے مزاح، تجرید، حقیقت پسندی، علامت نگاری کو اپنے اس بنیادی موضوع کے حوالے سے استعمال کیا ہے۔ انسان کی غیر انسانی صورتِ حال سے لے کر فکر کی انسان ساز شکلوں تک بہت کچھ ان کی شاعری کا حصہ بنا ہے۔ عشق و محبت،

معیشت، تہذیب، تاریخ، نفسیات، سیاست، اخلاقیات وغیرہ کو عصری انسان کی شناخت کے لیے استعمال کر کے ظفر اقبال نے غزل کا کینوس وسیع کر دیا ہے۔ کھردری، ناہموار حسیت سے مملوان کی نئی غزلیں اردو غزل کی تاریخ میں انتہائی ممیز دکھائی دیتی ہیں۔"(۱۴)

انسان اور متعلقاتِ انسان، تہذیب، معاشرت، معیشت، سیاست، مذہب، اخلاقیات، روحانیات، نفسیات، آشوبِ عہد، ظلم و استحصال، احساسِ ذلت، غربت، ناانصافی، بے روزگاری، رشوت، قتل و غارت، انتشارِ ذات اور تضادات یہ سب اور دیگر انسان سے وابستہ معاملات ظفر اقبال کی غزل میں بکھرے پڑے ہیں۔ ہم ظفر اقبال کی غزل میں دل کے استعارے کی متنوع جہات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ظفر اقبال کے ہاں دل مختلف استعاروں میں ڈھلتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور دل انسان کا اہم ترین عضو ہے۔ دل اور انسان لازم و ملزم ہیں۔ گویا ظفر اقبال کے ہاں دل کا استعارہ انسان ہی ہے۔ کیونکہ ظفر اقبال عصرِ حاضر کے جدید غزل گو ہیں تو دل کا استعارہ بھی عصرِ حاضر کا انسان ہے۔ جیسا کہ راقم الحروف نے پہلے ذکر کیا کہ ظفر اقبال کے ہاں دل مختلف استعاروں میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ جیسے گھر، عشق و جنون، زندگی کی وسعت، روحانیت اور کربلا، دل کی یہ تمام استعاراتی جہات بھی انسان اور انسانی زندگی سے منسلک ہیں۔ لہٰذہ ظفر اقبال کے ہاں دل کا استعارہ عصرِ حاضر کا انسان ہے۔ جدید انسان ہے۔

ظفر اقبال نے دل کو استعاراتی سطح پر عصرِ حاضر کے انسان کی صورت پیش کیا اور اپنی غزل میں عصری صورتِ حال سے نبرد انسان کے احوال کی عکاسی کی۔ اس کی خانگی، شہری، معاشی، معاشرتی، سیاسی سماجی اور نفسیاتی الجھنوں کی تصویر کشی کی۔

دنیا کی دولت کو دیکھ
اور دل کی ناداری سُن

(تمجید اب تک، جلد سوم، ظفر اقبال، ص: ۱۶۵۴)

جدید دنیا میں دولت کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ عزت، تعلق، رشتہ داری کا معیار دولت ہے۔ ایک عام انسان مجبور و مقہور اور نادار ہے۔ وہ دو وقت کے کھانے کو بھی ترستا ہے جبکہ دوسرا انسان یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کی جائیدادیں، جاگیریں کتنی اور کہاں کہاں ہیں۔ ظفر اقبال معاشی

ناہمواری اور طبقاتی کشمکش کو عہدِ حاضر کے انسان کا بڑا اہم اور سنگین مسئلہ سمجھتے ہیں اور اسی پر غمگیں ہیں۔ دل، نادار، مظلوم، مجبور انسان کا استعارہ ہے۔

دل خریداری کو خالی جیب نکلے گا یہاں
جب بڑھا لیں گے دکانیں یہ نکھٹو آئے گا

(غبار آلود سمتوں کا سراغ،اب تک، جلد اول، ظفر اقبال، ص:۵۶۶)

ظفر اقبال دل کو عصرِ حاضر کا انسان قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ غربت، بے روزگاری اور عدم مساوات سے جدید عہد کے انسان کو واسطہ ہے اور مارا مارا پھرتا ہے۔ کوئی اسکا پرسانِ حال نہیں ہے۔ کوئی ڈھارس بندھانے والا نہیں۔ کوئی مددگار نہیں۔ بلکہ طعنے تشنے اس کا مقدر ہیں۔ نکھٹو کا لفظ شعر میں طنز، مزاح کی بھی کیفیت پیدا کر رہا ہے۔

علی اکبر ناطق ظفر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''یہی وہ شاعر ہے جسے آپ جدید ٹیکسٹ کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ بات کا الٹ پھیر، استعاروں کو مصرعے میں بیچ دینا، اور لفظ اور خیال کی آمیزش سے شعر کو ہلکے طنز، ہنسی اور سنجیدگی کی ملی جلی بناوٹ سے ایسے برتنا کہ انسان اس شعر پر نہ ہنس سکتا ہے، نہ رو سکتا ہے اور نہ چپ بیٹھ سکتا ہے۔''(۱۵)

ظفر اقبال لفظ کے غیر معمولی استعمال میں اپنا ہنر دکھاتے ہیں اور صورت حال بدل دیتے ہیں، لفظ اپنے معانی خود کھولتا چلا جاتا ہے۔ جیسے مندرجہ بالا شعر میں نکھٹو کے لفظ سے شعر کی فضا ہی بدل گئی ہے۔

دل نے پھیلا بھی رکھا ہے ہاتھ
پھر بھی سائل نہیں لگ رہا

(تخفیف،اب تک، جلد چہارم، ظفر اقبال، ص:۲۸۲۰)

ظفر اقبال جدید حسّیت کے عکاس ہیں اور دل کو عصرِ حاضر کے جدید انسان کے استعارے میں ڈھال کر عصری مسائل کے کئی زوایے دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ جدید دنیا، بینکنگ، ملٹی نیشنل کمپنیوں، بیمہ پالیسیوں یا اس طرز کے کئی دوسرے معاملات ڈیبٹ کارڈ وغیرہ کے توسط سے چل رہی

ہے۔پیسے کی ترسیل کا ایسا نظام ہے کہ سرمایہ دار نے سب کو اپنے چنگل میں ایسا جکڑ رکھا ہے کہ کوئی اس سے نکل نہیں سکتا، اس عہد میں ہر فرد سائل بھی ہے اور مقروض بھی۔مگر پھر بھی جدید ہتھکنڈوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ خود کو سائل نہیں سمجھتا نہ دیکھنے والوں کو ایسا لگتا ہے۔جبکہ حقیقتاً وہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہے۔ظفر اقبال جدید انسان اور اسکی زندگی سے وابستہ سربستہ راز کھولتے چلے جاتے ہیں اور استعاروں میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔

معلوم نہیں دل کے ہیں کس طرح کے احوال
مدت ہوئی ہے اپنے وطن سے نہیں گزرا

(ترمیم۔اب تک، جلد پنجم، ظفر اقبال، ص:۳۸۵۴)

جدید عہد کا انسان معیشت اور رزوق روٹی کے چکر میں ایسا پھنسا ہے کہ جینے کا واحد مقصد حصولِ دولت بن کر رہ گیا ہے۔وہ رزق کی تلاش میں اور سہولیات کے حصول کی خاطر ملکوں ملکوں خاک چھانتا پھرتا ہے۔رشتے ناطے، ماں باپ، ملک وطن سب سے بے نیاز ہو چکا ہے۔افتخار عارف نے کہا تھا۔

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری ہجرت کیا

(افتخار عارف)

عصر حاضر کا انسان اپنوں بیگانوں سے بے خبر ہو چکا ہے۔اس کے پاس نہ اپنے لیے وقت ہے نہ اپنوں کے لیے۔جدید دنیا نے جتنے فاصلے سمیٹ دیے ہیں دراصل اس سے کہیں زیادہ بڑھا دیے بھی ہیں۔ڈاکٹر افتخار بیگ ظفر اقبال کے فرد اور دنیا کے ربط کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ:

> ''ظفر اقبال کی شاعری کا مطالعہ ہمیشہ یہی احساس پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے کہ یہ خون سے لکھی تحریر ہے اور اسے سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے دل و جان یکجا ہوں کیونکہ ظفر اقبال نے دنیا اور فرد کے ربط کو جذبے کی گہرائی سے محسوس کر کے لفظوں میں سمو دیا ہے۔ایسے میں اس کی تخلیقات کا اتھلا مطالعہ کسی طور صحیح نتائج کے استخراج کا باعث نہیں ہو سکتا۔''(۱۶)

کیونکہ ظفر اقبال کی غزل کا مرکزی موضوع انسان ہے تو اسی لیے متعلقاتِ انسان، معاشرہ ، دنیا اور دیگر چیزیں بہت اہمیت کی حامل ہیں اور جب تک جذبے کی شدت سے تشکیلِ شعر نہ ہو وہ اثر آفریں نہیں ہوتا نہ اپنے مفاہم و مطالب قاری پر کھولتا ہے۔ ظفر اقبال دل کو عصرِ حاضر کے انسان کے استعارے میں ڈھال کر اپنے بیان کی نیرنگیاں دکھلاتے چلے جاتے ہیں۔

دل کسی بیگار پر ہی رکھ لیا ہوتا کہ یہ
کام کرنا چاہتا ہے اور بے کاری میں ہے

(تادیب،اب تک، جلد پنجم، ظفر اقبال، ص: ۳۳۳۳)

دل بے کار پھرا کرتا ہے گلیوں گلیوں
شاید تیرے پاس یہ نوکر لگ سکتا ہے

(ترمیم،اب تک، جلد پنجم، ظفر اقبال، ص: ۳۸۹۲)

ظفر اقبال کے موضوعات جدید زمانے کے عصری مسائل سے ہم آہنگ ہیں۔ جن سے عصرِ حاضر کا انسان دوچار ہے۔ عہدِ رواں کا سب سے بڑا مسئلہ غربت ، بے روزگاری، اور معیشت کی زبوں حالی ہے۔ ظفر اقبال اپنے ملکی اور معاشرتی حالات اور انسانی حالتِ زار کے مصور ہیں۔ ان کا مشاہدہ بہت وسیع ہے اور بیان پر دسترس حاصل ہے۔ جدید حسّیت میں عصری مسائل ظفر اقبال کے شعر میں ڈھل کر اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں۔ بیگار پر لینا، بے کاری، نوکری نہ ملنا جیسے الفاظ اس عہد کے وہ جھمیلے ہیں جو کہ طبقاتی تفاوت، ظلم و ناانصافی، عدم مساوات، ناقص منصوبہ بندی، اقربا پروری اور میرٹ کی پامالی کی عصری ملکی صورتحال کی مکمل ترجمانی کرتے ہیں اور جس سے ملکِ خداداد کے ہر انسان کو سابقہ پڑتا ہے۔ ڈاکٹر عابد سیال ظفر اقبال پر ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ :

> ''اہل جدیدیت کے نزدیک جدید تخلیق کار کے پاس زندگی کی نئی تعبیروں، نئے انسان کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور دیگر گوناں گوں تصورات کی شکل میں تازہ افکار کا وسیع خزانہ موجود ہے۔ مسئلہ زبان کا ہے کہ روایتی شعری زبان میں اس پیچیدگی کی ترسیل ممکن نہیں''(۱۷)

ظفر اقبال کیونکہ زبان وبیان کو شاعری میں مرکزی اہمیت دیتے ہیں اور زبان وبیان کے بہت سے تجربات سے گزر چکے ہیں اس لیے وہ جدید زندگی، عصرِ حاضر اور جدید انسان کی تمام الجھنوں اور پیچیدہ افکار و خیالات کو شعری جامہ پہنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ جدید انسان کے نئے خیالات و افکار کو نئے، نامانوس الفاظ میں سمو کر ہر سطح پر جدت پیدا کرتے ہیں۔

درشت خُو تو نہیں تھوڑا لالچی ہے یہ دل
جو تیرے تابع فرمان بھی ہو سکتا ہے

(تفریق،اب تک، جلد پنجم، ظفر اقبال، ص:۳۶۷۶)

دل اتنا مفلس و نادار تو کبھی نہیں تھا
یہ جو آنکھ اپنی ترے مال و زور کے اوپر ہے

(تفریق،اب تک، جلد پنجم، ظفر اقبال، ص:۳۷۴۳)

ظاہری، سطحی نظر سے دیکھا جائے تو یہ عشقیہ اشعار لگتے ہیں مگر تھوڑا غور کیا جائے تو یہاں دل عصرِ حاضر کے انسان کی ذیل میں آیا ہے اور اوپر والے شعر میں لالچ ،درشت خُو ، تابع فرمان کے الفاظ واضح دلیل ہیں کہ دل بہ معانی دل نہیں بلکہ انسان آیا ہے۔ دوسرے شعر میں مفلس، نادار اور مال وزر پر نظر سے بھی دل کی استعاراتی توجیہ ظاہر ہوتی ہے۔ لالچ، مفلسی، ناداری، عصرِ حاضر کے انسان کی کیفیات کے عکاس ہیں اور یہی مفلسی، ناداری اور غربت انسان کو اہل ثروت کے تابع فرمان بناتی ہے۔ ظفر اقبال کی منفرد استعارہ سازی کے حوالے سے ڈاکٹر قاضی جمال حسین لکھتے ہیں:

> ''ظفر اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ وہ لسانی تجربہ ہے جس نے شاعری کی فضا میں ایک نیا اور انوکھا رنگ شامل کر دیا ہے۔ ایسے الفاظ، استعارے اور تراکیب جو اپنی طبعی عمر کو پہنچ چکے تھے ظفر اقبال کی شاعری میں نظر نہیں آتے۔ ظفر اقبال کی غزلوں میں نومولود الفاظ یکسر نئے مفاہیم اور انسلاکات کا حلقہ تعمیر کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جن کی طرفگی اور ندرت قاری کیلئے خوشگوار تجربہ ہے''(۱۸)

ظفر اقبال کی غزل بظاہر سادہ مگر در حقیقت پیچیدہ ہے۔ شعر غور کرنے پر کھُلتا چلا جاتا ہے ،اپنی پرتیں ظاہر کرتا جاتا ہے اور الفاظ کے نئے در وا ہوتے جاتے ہیں۔ لفظ کی نئی معنویت سمجھ آنے

لگتی ہے۔ تشبیہ، استعارہ، کی قلعی کھُلنے لگتی ہے۔ ظفر اقبال خود اس طرف بڑے واضح اشارے کر چکے ہیں۔ ان کا شعر دیکھیے جو مجاز کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔

راستی ہے اگر تو اتنی سی
ہر حقیقت مجاز ہے مجھ میں

(تخفیف، اب تک، جلد چہارم، ظفر اقبال، ص: ۲۷۶۰)

ظفر اقبال شعور کی رو میں شاعری کرنے والا شاعر ہے۔ اُس کا واضح نظریہ زبان کو وسعت دینا اور غزل کی یژمردگی اور تھکن اتارنا ہے اور تازگی پیدا کرنا ہے۔ کلی شیز کا خاتمہ کرنا ہے تاکہ صنفِ غزل کا دامن بھی کشادہ ہو اور زبان کا بھی

دن رات اُسی چوکھٹ پہ پڑا رہتا ہے
دل ہے، کیا کیجئے، غرضی ہے میاں

(رطب و یابس، اب تک، جلد اول، ظفر اقبال، ص: ۳۶۵)

ظفر اقبال زندگی انسان اور معاشرتی چلن کی ترجمانی کرتے ہوئے عہدِ حاضر کے انسان کی داخلی، خارجی اور نفسیاتی صورتِ حال کو دل کے استعارے میں ظاہر کرتے ہیں۔ حرص، لالچ، مطلب پرستی اس عہد کا چلن ہے۔ وہ محبت ہو یا دنیاوی مفاد جب تک طمع ہے تو لوگ ہر وقت آگے پیچھے پھرتے ہیں اور خوشامد، منت سماجت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ صورت حال اربابِ اختیار کے پاس جا کر بھی دیکھی جا سکتی ہے کہ ان کے اطراف کس طرح لوگوں کا تانتا بندھا ہوتا ہے۔ جھوٹی عزت و تکریم کی جا رہی ہوتی ہے کیونکہ اس دور میں خوشامد اور پروٹوکول دے کر دلوں کو لبھایا جا سکتا ہے اور اپنا کام نکلوایا جا سکتا ہے۔ سرکاری دفاتر، عدالتوں، تھانے کچہری ہر جگہ لوگ عدل و انصاف کی غرض سے پڑے ہوتے ہیں۔ عمریں بیت جاتی ہیں مگر انصاف نہیں ملتا۔ جوتے گھِس جاتے ہیں ملازمت نہیں ملتی۔ ظفر اقبال معاشرے کے ان ناسوروں پر کڑھتے اور بِلبلاتے ہیں اور انسان کی داخلی اور خارجی حالت سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

محبت واجبی اچھی ہے اے دل
اسے اعصاب پر طاری نہ کر

(عیب و ہنر،اب تک، جلد اول، ظفر اقبال، ص: ۶۴۴)

اس عہد میں جدید انسان گو ناگوں مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ اعصابی اور نفسیاتی الجھنیں، ڈپریشن نے اسے اپنی زد میں لیا ہوا ہے۔ معاملاتِ محبت ہوں یا خانگی زندگی، معاشی یا معاشرتی مسائل ہوں یا روحانی و اخلاقی، اس عہد کا انسان بے سکونی، بے قراری بلکہ حالتِ اضطرار میں ہے۔

ظفر اقبال دل کو استعاراتی قالب میں ڈھال کر اس سے عصرِ نو کے انسان کی زندگی کے مختلف پہلو اُجاگر کرتے ہیں۔ استعارے کے حوالے سے محمد حسن عسکری نے کہا تھا کہ:

> ''استعارے میں سوال یہ نہیں ہوتا کہ وہ منطق کی حد میں قرین قیاس ہے یا نہیں دیکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ استعارے کا خالق ان مختلف عناصر سے کتنا ربط قائم کر سکا ہے اور انھیں آپس میں حل کر کے ایک نئی اور معنی خیز وحدت کی تشکیل کر سکا ہے۔ یا نہیں۔۔۔استعارہ جذبے اور فکر کی علیحدگی ختم کر کے انھیں ایک دوسرے میں جذب کر دیتا ہے۔ شعور اور لاشعور، جسم اور دماغ، فرد اور جماعت، انسان اور کائنات کا وصال اسی کے وسیلے سے ہوتا ہے۔''(۱۹)

ظفر اقبال کی استعارہ سازی قرین قیاس بھی ہے، منطق پر بھی پوری اترتی ہے اور باربط بھی، نئی معنویت بھی مبہم نہیں۔ ظفر اقبال محمد حسن عسکری کی رائے پر پورا اترتے ہیں اور استعارے کے وسیلے سے داخل و خارج، شعور اور لاشعور، فرد اور جماعت اور اپنی غزل کے مرکزی موضوع انسان اور کائنات کا وصال کراتے ہیں اور کامیاب ٹھہرتے ہیں۔

اس کی مذمت میں ہیں یوں تو بیانات دل
ساری دلیلیں مگر اسکی حمایت میں ہیں

(تماشا،اب تک، جلد دوم، ظفر اقبال، ص: ۱۳۹۴)

ملکی صورتحال اور سیاسی حالات پر ظفر اقبال کا تبصرہ اس لیے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ وہ شاعر کے ساتھ صحافی، کالم نگار اور بذات خود سیاست دان بھی ہیں اور باقاعدہ الیکشن بھی لڑ چکے ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے فاؤنڈر ممبران میں سے تھے۔ بعد میں اختلافات کی وجہ سے الگ ہو گئے

۔ ملکی داخلی و خارجی صورتِ حال کے آئینے میں دیے گئے مذہبی بیانات، قراردادیں، دلیلیں، تاویلیں ہماری سیاسی ملکی صورتِ حال کی عکاس ہیں کہ کس طرح سیاست مدار، دن کو رات اور رات کو دن قرار دیتے ہیں۔ ہر سانحے پر مذمتی بیانات اور قراردادیں پیش ہوتی ہیں مگر عملی طور پر کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ پاکستانی معاشرہ تنزلی کی طرف جارہا ہے۔ ظفر اقبال دل کے استعارے کی مدد سے عصری انسان کو درپیش حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔

یہ دل اپنی حفاظت کا ہے ذمہ دار خُود
علاقہ یہ بھی ہم نے بے اماں رکھا ہوا

(تادیب،اب تک، جلد پنجم، ظفر اقبال، ص:۳۲۸۹)

ظفر اقبال جدید حسیّت، عصری آگہی اور عصرِ حاضر کے انسان کے نباض ہیں۔ خاص طور پر پاکستانی معاشرت کی ذیل میں ان کا مشاہدہ اور شعور بہت پختہ ہے۔ آئے روز قتل و غارت، ظلم و ستم، بم دھماکے، خودکش حملے، ٹارگٹ کلنگ اور بد امنی سے کوئی بھی انسان محفوظ نہیں ہے۔ حکومتی کارروائی تسلی، دلاسے اور مذمت سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

ڈاکٹر سعادت سعید لکھتے ہیں کہ:

> ''ظفر اقبال نے اپنی غزلوں میں زباں بندی، احوالِ عالم، درد پردہ معاملے، ذاتی اظہار، آشوبِ عہد، شعورِ زندگی، انسانی کم مائیگی، حیات اسیری، قوتِ محرومی، احساسِ ذلت و شکست، حکومتی اتار چڑھاؤ، ہر نوع کی بربادی، سلطنت زوالی، اخلاقی و مادی مفلسی، ناجائز دولتی، ظلم و استحصال و استیصال، بے داد گری، انصاف طلبی، مذہبی غیر رواداری، مادی و روحانی تضاد، نظامِ نو کی تلاش، کاروباری اخلاقیات وغیرہ کو خصوصی اہمیت دی ہے۔''(۲۰)

ظفر اقبال جدید حسیّت اور عصرِ حاضر کے انسان کو دل کے استعارے میں ڈھال کر زوایے بدل بدل کر دیکھتے ہیں اور جدیدِ دنیا میں جدید انسان کی عصری صورت حال، زندگی، ماحول، معاشرت، معیشت، وسائل، مسائل، اخلاقیات مذہب، فکر و خیالات، سیاسی جغرافیائی تبدیلیوں، رسوم ورواج کے بدلاؤ، عدم برداشت داخلی و خارجی عوامل، ذہنی روحانی الجھنوں، خانگی معاملات اور کربِ

ذات کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں اس پر تبصرہ بھی کرتے ہیں اور صورتِ حال کی مکمل عکاسی بھی کرتے ہیں۔ حالات پر کُڑھتے بھی ہیں، طنز بھی کرتے ہیں اور غمگیں بھی ہوتے ہیں اور شدتِ غم سے پکار اٹھتے ہیں کہ:

ہوتے ہوتے دل کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا
صبح کا جلوہ گیا اور شام کی لالی گئی

(تادیب،اب تک، جلد پنجم، ظفر اقبال، ص:۳۳۰۶)

ظفر اقبال دل کے استعارے میں انسان کی جو عصری صورتِ حال کی تصویر کشی کرتے ہیں وہ پریشان کن بھی ہے اور قابل افسوس بھی۔ ظفر اقبال کی غزل میں دل کلیدی استعارہ ہے جس کی کلیدی جہت عصرِ حاضر کا انسان ہے۔ مزید کئی جہات اور کئی ابعاد ہیں۔ کچھ روایتی کچھ متنوع، جدید حسیّت اور عصر نو کے ساتھ ہم آہنگ۔ ظفر اقبال کی غزل میں دل حقیقی ہی نہیں بلکہ مجازی معانی و مفاہم میں استعمال ہوتا ہے۔ جس سے مراد انسان ہے۔ جدید عہد، کا عصر حاضر کا انسان۔ دل کے استعارے کا پھیلاؤ بھی انسانی زندگی کے متعلقات جیسا ہے۔ وسیع، مختلف النوع اور سورنگ۔

بقول ظفر اقبال

اپنے دل میں ہے ایک اور بھی دل
اس خلا میں ہے ایک اور خلا

(رطب و یابس،اب تک، جلد اول، ظفر اقبال، ص:۳۱۰)

ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ ظفر اقبال کے اس شعر کے مصداق ہے جس کی کئی جہات اور ابعاد ہیں۔

آسماں پر کوئی تصویر بناتا ہوں ظفر
کہ رہے ایک طرف اور لگے چاروں طرف

(اطراف،اب تک، جلد دوم، ظفر اقبال، ص:۹۴۰)

حوالہ جات

۱۔ ظفر اقبال، ''حمیدہ شاہین کا ایک شعر''مشمولہ:ماہِ نو، جلد۵۷، شمارہ نمبر۹/۱۰، ستمبر۔اکتوبر ۲۰۰۴ء،ادارت: پروین ملک، ادارہ مطبوعات، لاہور، ص۳۵

۲۔ ڈاکٹر ضیا الحسن ''پاکستانی غزل''مشمولہ:اب تک ،کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، جلد سوم، ملٹی میڈیا افیئرز لاہور،۲۰۰۶ء، ص:۲۳۳۳،۲۳۳۶

۳۔ ظفر اقبال ''تازہ شاعری میں میری تلاش اور دستیابی کا مسئلہ''مشمولہ:ادبیات، شمارہ ۷۲، جولائی۔ستمبر ۲۰۰۶ء، ادارت: محمد عاصم بٹ، ڈاکٹر راشد حمید، علی یاسر،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد ص:۱۳۰

۴۔ ڈاکٹر سید عبداللہ،ولی سے اقبال تک،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۰:ص:۴۷

۵۔ ڈاکٹر افتخار بیگ، ظفر اقبال کی شاعری، ''درونِ ذات کا شعلہ'' مشمولہ: انگارے، مرتبہ، سید عامر سہیل، کتابی سلسلہ نمبر۴۸،۲۰۰۶ء، گل گشت کالونی،ملتان، ص:۷۷

۶۔ جاذب قریشی، ظفر اقبال غزل کا لیجنڈ، مشمولہ:اب تک (کلیات غزل)، ظفر اقبال، جلد پنجم، رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی،۲۰۱۶ء، ص:۳۲۲۰

۷۔ ظفر اقبال،آبِ رواں، مشمولہ:اب تک، کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، جلد اول، ملٹی میڈیا افیئرز،لاہور،۲۰۰۴، ص:۱۵۵

۸۔ شمس الرحمن فاروقی ''طبع رواں،منظرِ معنی اور بے شمارا مکان'' مشمولہ:اب تک ،کلیات غزل، ظفر اقبال، جلد اول، ملٹی میڈیا افیئرز لاہور ۲۰۰۴ ص:۵۱

۹۔ عمران اذفر، ''انکار دوسروں کی حقیقت سے ہو جسے''مشمولہ:انگارے،مرتبہ ،عامر سہیل،کتابی سلسلہ ۴۸(ظفر اقبال نمبر) گل گشت کالونی،ملتان،۲۰۰۶،ص:۹۵

۱۰۔ گوپی چند نارنگ،سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۱۹۹۱، ص:۲۳

۱۱۔ ظفر اقبال ''مکالمہ''مشمولہ:ادبیات،شمارہ ۷۲ جولائی ستمبر،۲۰۰۶،ادارت: محمد عاصم بٹ، ڈاکٹر راشد حمید، علی یاسر،اکادمی ادبیات پاکستان، ص:۱۱۱

۱۲۔ گوپیچند نارنگ،سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۱، ص:۱۰۳

۱۳۔ عمران اذفر،انکار دوسروں کی حقیقت سے ہو جسے، مشمولہ:انگارے، کتابی سلسلہ نمبر ۴۸، ظفر اقبال نمبر، مرتبہ: سید عامر سہیل، گل گشت کالونی، ملتان،۲۰۰۶، ص ۹۳

۱۴۔ ایم خالد فیاض،''ڈاکٹر سعادت سعید اسے ایک انٹرویو(ظفر اقبال کے حوالے سے)'' مشمولہ:انگارے، مرتبہ عامر سہیل(ظفر اقبال نمبر)گل گشت کالونی ملتان،۲۰۰۶ ص:۳۲

۱۵۔ علی اکبر ناطق ''ظفر اقبال ایک عہد ایک اسلوب'' مشمولہ:اب تک کلیاتِ غزل، ظفر اقبال ، جلد پنجم، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی،۲۰۱۶ ص:۳۶۶۲

۱۶۔ ڈاکٹر افتخار بیگ، ظفر اقبال کی شاعری، درونِ ذات کا شعلہ، مشمولہ:انگارے مرتبہ سید عامر سہیل(ظفر اقبال نمبر)کتابی سلسلہ ۴۸، گل گشت کالونی ملتان، ۲۰۰۶، ص:۷۳

۱۷۔ ڈاکٹر عابد سیال ''ظفر اقبال کو پڑھتے ہوئے''مشمولہ:اب تک،کلیاتِ غزل، ظفر اقبال، جلد پنجم، رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی،۲۰۱۶: ص۳۹۳۹

۱۸۔ ڈاکٹر قاضی جمال حسین ''ظفر اقبال کا وہم و گماں''مشمولہ: اب تک،کلیاتِ غزل، ظفر قبال، جلد دوم، ملٹی میڈیا افیئرز،لاہور ۲۰۰۵، ص:۸۹۶

۱۹۔ محمد حسن عسکری،استعارے کا خوف، مجموعہ محمد حسن عسکری،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۱۹۹۴، ص:۱۹۹،۱۹۷

۲۰۔ ڈاکٹر سعادت سعید ''خیال خلقی اور زبانِ انتظاری کی شاعری''مشمولہ: اب تک، کلیات غزل، ظفر اقبال، جلد سوم، ملٹی میڈیا افیئرز لاہور، ۲۰۰۶، ص ۱۵۴۱

ماحصل

قیامِ پاکستان کے بعد (ساٹھ ۶۰ کی دہائی میں) منظرِ عام پر آنے والے شعرا میں ظفر اقبال ایک اہم نام ہے۔ ظفر اقبال اردو غزل کے رجحان ساز شاعر ہیں۔ منفرد اسلوب، جدت پسندی اور موضوعات کا تنوع ان کی غزل کی پہچان ہے۔ ظفر اقبال نے اردو غزل کی روایت میں کلاسیکی مزاج کی حامل غزل بھی لکھی اور باغیانہ روش بھی اختیار کی۔ اینٹی غزل اور لسانی تشکیلات کے تجربات بھی کیے۔ رائج ضابطے توڑے اور لفظوں کو نئے جوڑ توڑ سے روشناس کرایا۔ اردو غزل میں، پنجابی، سرائیکی، پشتو، سندھی، بلوچی، انگریزی وغیرہ کی پیوند کاری کی اور زبانوں کا درمیانی فاصلہ کم کرنے کی شعوری سعی کی اور اردو زبان کو وسعت بخشی۔ انھوں نے زبان اور اردو غزل کے نئے امکانات منظرِ عام پر لانے کی خلوصِ دل سے کوشش کی۔ ظفر اقبال پُر گو شعر ہیں۔ ظفر اقبال کی پُر گوئی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب تک کے عنوان سے ان کے ۵ ضخیم کلیاتِ غزل منظرِ عام پر آ چکے ہیں اور چھٹا کلیاتِ غزل بھی مستقبل قریب میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے والا ہے۔ پنجابی شاعری، نثری نظمیں، تنقیدی اور صحافتی تحریریں اس کے علاوہ ہیں اور ظفر اقبال کی خلاقیت کا یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔

زیرِ بحث مقالہ کا عنوان ''**ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ، اردو غزل کی روایت کے تناظر میں: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ**'' ہے۔ اس موضوع کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ تحدید کی گئی کہ ظفر اقبال کی غزل میں دل کے استعارے کا مطالعہ کیا جائے گا اور ظفر اقبال کی دیگر تحریروں اور ادبی تخلیقات (تنقیدی، صحافتی، پنجابی شاعری نثری نظمیں وغیرہ) کا مطالعہ بنیادی حیثیت کا حامل نہیں ہو گا۔

سوالاتِ تحقیق یہ تھے کہ استعارہ کیا ہے؟ اردو غزل میں دل کے استعارے کی روایت کیا ہے؟ ظفر اقبال کی غزل میں استعارہ سازی کا عمل؟ اور ظفر اقبال کی غزل میں دل کے استعارے کی معنویت کیا ہے؟ یہ مفروضہ قائم کیا گیا کہ ظفر اقبال کا اپنا ایک استعاراتی نظام ہے اور اس استعارہ سازی کے عمل میں ظفر اقبال کا کلیدی استعارہ دل ہے۔

مندرجہ بالا سوالات تحقیق کے پس منظر میں بنیادی مقاصد ان سوالات کے جوابات کے ذریعے ظفر اقبال کی غزل میں استعارہ سازی بالخصوص دل کے استعارے کی کھوج لگانا تھا جو کہ ان کا کلیدی استعارہ ہے۔

تحقیقی موضوع کے مسئلے، مفروضے اور مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے باب اوّل کا عنوان: ''ظفر اقبال: سوانحی و شعری تعارف'' طے پایا کیونکہ ظفر اقبال کے سوانحی حالات کی تفصیلات زیادہ نہیں ملتیں اس لیے یہ ضروری جانا کہ ان کا سوانحی خاکہ شامل کیا جائے تاکہ ظفر اقبال جیسے اہم شاعر کے حالاتِ زندگی منظر عام پر لائے جا سکیں اور اسی باب کے حصہ دوم میں ظفر اقبال کا تعارف ان کے اشعار کی روشنی میں پیش کیا گیا۔ ناقدین کی آرا کو بھی شامل کیا گیا تاکہ ظفر اقبال کی اہمیت و انفرادیت کھل کر سامنے آ سکے اور عمومی مزاج سے شناسائی حاصل کی جا سکے۔

اس باب میں ظفر اقبال کے خاندان، قوم، علاقہ، جائے پیدائش، ابتدائی و ثانوی تعلیم، اعلیٰ تعلیم، تعلیمی ادارے سکول، کالج، یونیورسٹی اور پیشہ ورانہ تعلیم یعنی وکالت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ظفر اقبال نے عملی زندگی کا آغاز وکالت سے کیا اور ہائی کورٹ لاہور میں پریکٹس کرنے کے ساتھ صحافت اور سیاست سے گہری وابستگی رہی۔ صحافت شاعری کے بعد ان کی دوسری پہچان ہے انھوں نے ہر قابل ذکر اخبار میں کالم نگاری کی اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور تا حال روزنامہ دنیا میں دال دلیا کے عنوان سے باقاعدہ کالم لکھ رہے ہیں۔ ان کے کالم ہلکے پھلکے سیاسی طنزیہ تجزیے اور ادب و شاعری سے مزین ہوتے ہیں۔ اردو کالم میں سرخیاں لگانے کا آغاز ظفر اقبال نے کیا۔ سیاسی زندگی کا آغاز پاکستان پیپلز پارٹی سے کیا اور وہ اس پارٹی کے بنیادی ارکان میں شامل تھے جبکہ مابعد اختلافات کی بنیاد پر پی پی پی کے مقابل پاکستان قومی اتحاد کے پلیٹ فارم سے الیکشن بھی لڑا۔ اُن کی خانگی زندگی کے حوالے سے بھی بتایا گیا کہ ظفر اقبال شمیم اختر (شمع بیگم) سے ۱۹۶۰ء میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے ان کی اولاد میں تین بیٹے، آفتاب اقبال، اویس اقبال اور جنید اقبال جبکہ ایک بیٹی عطیہ بانو ہیں۔ دیگر ادبی خدمات کے طور پر ظفر قبال نے سویرا کی ادارت بھی کی اور دو سال اردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر جنرل بھی رہے۔ ظفر اقبال کی علمی، ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں کئی انعامات و اعزازات کے علاوہ ۹۸-۱۹۹۷ تمغہ حسن کارکردگی ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' سے نوازا گیا۔

ظفر اقبال کا پہلا شعری مجموعہ آبِ رواں کے نام سے ۱۹۶۲ء میں منظر عام پر آیا اور اسے بے حد پذیرائی ملی یوں ظفر اقبال نے پاک و ہند میں اپنی بھرپور آمد کا اعلان کیا اور ہر قابل ذکر ادبی رسالے اور ناقد کی توجہ جذب کی۔ ظفر اقبال کی شاعری زبانِ زد عام ہونے لگی۔ ۱۹۶۶ء میں ظفر اقبال کا دوسرا مجموعہ گلاآفتاب شائع ہوا جس میں لسانی تجربات کیے گئے اور ایک نیا اسلوب متعارف کرایا گیا جہاں اس مجموعے کو بعض اہم ناقدین نے بے حد سراہا اور داد دی وہاں ظفر اقبال کی مخالفت اور رد میں بھی بے حد لکھا گیا اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔

ظفر اقبال کے کئی مجموعے شائع ہوئے انھوں نے اب تک کے عنوان سے پہلا کلیات غزل ۲۰۰۴ میں شائع کرایا اور اب تک، اب تک کی پانچ ضخیم جلدیں زیورِ طباعت سے ہمکنار ہو چکی ہیں۔ چھٹا کلیاتِ بھی ۲۰۱۹-۲۰ء میں چھپ جائے گا۔ ظفر اقبال پانچوں کلیات میں چھ چھ مجموعے شامل ہیں اور ہر کلیات ہزار صفحات پر مشتمل ہے ہر مجموعے میں ۱۲۱ غزلیں ہر غزل کم از کم ۹ اشعار پر مشتمل ہے اور غزل کے اشعار کی تعداد ۳۲۶۷۰ ہے۔ ظفر اقبال کے دل کے موضوع اور دل کے استعارے کے حوالے سے اشعار کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے۔

اردو غزل کے علاوہ ظفر اقبال کا پنجابی شاعری کا کلیات پنڈو کڑی اردو کالم کے دو مجموعے، خشتِ زعفران اور دال دلیا اور تنقیدی مضامین لا تنقید کے عنوان سے چھپ چکے ہیں اسی باب کے حصہ دوم میں ظفر اقبال کی شاعری کے مختلف رنگ اور ذائقے تعارف کے طور پر سامنے لائے گئے ہیں اور اہم، قابل ذکر ناقدین کی آرا بھی شامل کی گئی ہیں۔ جن میں افتخار جالب، شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، مشفق خواجہ، انتظار حسین، محمد اظہار الحق، ڈاکٹر ضیاء الحسن، ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر عابد سیال، ناصر عباس نیر وغیرہ شامل ہیں۔ شعرِ ظفر اقبال اور ناقدین کی آرا سے فیض یاب ہو کر باب اول میں ظفر اقبال کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ظفر اقبال کی کلاسیکی مزاج کی غزلیات، لسانی تشکیلات کے تجربات زبان و بیان اور اسلوب کے بدلتے ذائقوں، روایتی اور جدید طرز احساس کے امتزاج، تخلیقی قوت، موضوعات کے تنوع اور انفرادیت، شاعری کی مقدار اور معیار، الفاظ کے ممکنہ استعمال اور نئی معنویت، انسانی اور کائناتی موضوعات، عصرِ حاضر اور جدت علامت و استعارات، ظفر اقبال کی قادالکلامی، شعریت اور غزل کے نئے امکانات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور انھیں عصرِ حاضر کا اہم جدید صاحبِ اسلوب

شاعر قرار دیا گیا ہے۔ جس نے اس عہد کے شعرا کو بے حد متاثر کیا ہے اور اس باب کے آخر میں ظفر اقبال کو خراج تحسین اور اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر عہدِ حاضر کے نظم گو شاعر سید عامر سہیل کی نظم دیوتا پیش کی گئی ہے جو اس بات کی غماز ہے کہ نئی نسل ظفر اقبال سے کس قدر متاثر ہے۔

باب دوم استعارہ کے نظری مباحث پر مشتمل ہے اس باب کے حصہ اول میں علمائے اہلِ بلاغت اور حصہ دوم میں مغربی اور اردو ناقدین ادب کی آرا کی روشنی میں استعارہ کی ادب بالخصوص شاعری میں اہمیت اور معنویت پر تحقیقی و تنقیدی بحث کی گئی ہے۔

استعارہ علم بیان کی ایک اہم شاخ ہے علم بیان پر علمائے بلاغت کی آرا شامل کی گئی ہیں اور تجزیے کے بعد راقم الحروف اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ بیان دراصل مجاز ہے۔ اور استعارہ علم بیان کی جان ہے۔ خیالات و افکار کی ترسیل میں استعارہ کا کوئی ثانی نہیں۔ استعارہ کے لغوی معانی اور ماہرین بلاغت کی تعریفیں اور بحثیں شامل کی گئی ہیں۔ جن میں نجم الغنی مولوی، سجاد مرزا بیگ، ممتاز حسین، عابد علی عابد، ڈاکٹر مزمل حسین وغیرہ شامل ہیں۔ ان مباحث کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ استعارہ میں لفظ غیر وضعی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور حقیقی یعنی لغوی معنی بطور مبالغہ استعمال ہوتے ہیں۔ حقیقی اور مجازی معنوں میں حدِ فاصل قرینہ ظاہر کرتا ہے۔ گویا استعارہ مجاز عقلی اور مجازِ لغوی ہے یعنی معنی میں تجاوز استعارہ ہے۔ یہاں لفظ استعارہ کی بابت ظفر اقبال کے اشعار بھی درج کیے گئے ہیں جو استعارہ کو سمجھنے اور ان کے استعارہ کی سمت رجحان کو ظاہر کرتے ہیں۔

ارکانِ استعارہ، مستعار لہ، مستعار منہ، اور وجہ جامع پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اقسام استعارہ کی وضاحت مثالوں کے ذریعے کی گئی ہے۔ استعارہ اور کذب، تشبیہ اور استعارہ کا فرق مدلل انداز میں زیرِ بحث لایا گیا۔ اسی باب کے حصہ دوم میں مغربی ناقدین اور اردو ادب کے قدیم و جدید ناقدین ادب کی آرا کی روشنی میں استعارہ کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ مغربی ناقدین میں ارسطو، سسرو، لائجائنس، دانتے، شیلے، ورڈزورتھ، کولرج اور ٹی ایس ایلیٹ کے تنقیدی نقطۂ نظر کو جاننے کو کوشش کی گئی ہے اور ان کا تنقیدی تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اہل مغرب کے نزدیک شاعری کی زبان کا امتیازی وصف استعاراتی اظہار ہی ہے۔ استعارہ تزئین کلام کا باعث بھی ہے اور نئے خیالات کی پیدائش کا وسیلہ بھی

اور وجدانی زبان کا جوہر بھی استعارہ ہے۔ یعنی اہلِ مغرب کے نزدیک استعارے کو ادب، شاعری میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ جبکہ اردو ادب میں استعارہ کے تنقیدی مباحث قدرے کم مقدار میں دکھائی دیتے ہیں۔

اردو ادب کے اولین ناقدین میں شبلیؔ، حالیؔ نے استعارے کو اہلِ بلاغت سے ذرا اوپر ہو کر دیکھنے کی کوشش کی شبلی نے استعارے کو فطری طرز ادا قرار دیا اور استعارے کو شاعری اور انشا پردازی کا جمال قرار دیا شبلی استعارے کی تشریح و تفہیم ہی تک محدود رہے جبکہ حالیؔ نے مقدمہ شعر و شاعری میں استعارے کو بلاغت کا رکنِ اعظم قرار دیا اور اہلِ نقد کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ اردو ناقدین میں محمد حسن عسکری نے استعارے کے مباحث کو اٹھایا اور حالی کی استعارے کی تعریف کو رد کرتے ہوئے استعارے کے خوف کی بات کی تو اس سے اردو تنقید میں استعارے کے مباحث نے جنم لیا۔ محمد حسن عسکری کے نزدیک تخلیق کار کسی بھی مردہ استعارے کو زندہ استعارے میں ڈھال سکتا ہے۔ نئے استعارے اور علامات خلق کر سکتا ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں محمد حسن عسکری نے استعارے کے جو مباحث اٹھائے اردو ادب کے بیشتر ناقدین اسی کے گرد گھومتے دکھائی دیتے ہیں مگر یہ بھی غنیمت ہے کہ کم از کم اردو تنقید میں استعارے ،علامت جیسے موضوعات پر اہل نقد نے توجہ تو کی۔ اور اس اہم موضوع پر قلم اٹھایا۔ انتظار حسین نے استعارے کو داخلی اور خارجی دنیا کے ربط کا بڑا ذریعہ قرار دیا۔ ممتاز حسین نے انقلابی استعارے کی اصطلاح وضع کی۔ محمد ہادی حسین کے خیال میں استعارہ وسعتِ زبان کا باعث ہے گوپی چند نارنگ کے بقول اظہار کے وسائل میں استعارے کو مرکزیت حاصل ہے اور استعارہ معانی در معانی کا سبب بنتا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر بھی محمد حسن عسکری کے تتبع میں تمام زبان میں استعارہ سازی کی صلاحیت کے قائل ہیں۔ رشید معیدی بھی اس بات کے قائل ہیں کہ ہمارے ہاں استعارے کی ماہیت پر غور و فکر اور اظہارِ خیال کا رواج عام نہیں، عابد علی عابد استعارے اور ذوقِ سلیم کو لازم و ملزوم گردانتے ہیں جبکہ شمس الرحمٰن فاروقی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مغرب میں ایسا کوئی قابل ذکر نقاد نہیں جس نے استعارے کی ذیل میں نہ لکھا ہو جبکہ ہماری شعریات میں استعارہ اتنا اہم نہیں جتنا مضمون۔

حاصلِ بحث یہ ہے کہ اب اردو اہلِ نقد استعارے کی اہمیت اور ماہیت کے قائل ہیں اور اس پیکر اسرار کو کھوجنے میں مصروف کار ہیں۔ استعارے کی اہمیت اور ماہیت سے جدید نقاد آگاہ ہیں مگر اس سمت مزید توجہ درکار ہے۔ اور اس جانب اہل نقد کی توجہ مبذول کرانے کا سہرا محمد حسن عسکری کے سر ہے۔

باب سوم میں ظفر اقبال کی غزل میں دل کے استعارے کو اردو غزل کی روایت کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ اس باب کے حصہ اوّل میں اردو غزل میں دل کے استعارے کی روایت میں میر تقی میرؔ، غالبؔ اور اقبال شامل ہیں اور یہ کڑی ظفر اقبال سے ملائی گئی ہے۔ اردو غزل میں دل کے استعارے کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود اردو غزل، اردو غزل کا کوئی بھی قابلِ ذکر شاعر ایسا نہیں ہے جس نے دل کے استعارے کو نہ برتا ہو مگر میر تقی میر، غالب اور اقبال نے دل کو بطور استعارہ بڑی خوبصورتی اور مہارت سے غزل میں سمویا۔ میر تقی میرؔ کے ہاں دل دلی کا استعارہ بن کر ابھرتا ہے میر نے دلی کی تہذیب کے اجڑنے اور دلی کی بربادی کو دل کی بربادی سے تعبیر کیا اور اسے ذاتی غم بنا دیا۔ غالب کے ہاں دل جذبہ، عشق جبکہ اقبال نے دل کو عشق اور وجدان اور دانش کے مفاہیم میں ڈھال کر نئی معنویت سے ہمکنار کیا۔

غالب اور اقبال نے بھی میر کی طرح دل کی ایسی معنویت پیدا کی کہ دل عضو جسمانی سے ماوراد کھائی دینے لگا اور کائناتی، آفاقی اور روحانی معنویت سے آراستہ ہوتا ہوا نئی تعبیر و تفہیم کا متقاضی ہوا۔ اور سینۂ کائنات میں دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے ایک بڑا فن کار لفظ کو اتنی خوبصورتی سے استعمال کرتا ہے کہ معانی کی کہکشاں سی بنتی چلی جاتی ہے، میر غالب اور اقبال کی شعری کائنات میں دل مرکز و محور دکھائی دیتا ہے۔

ظفر اقبال، میر، غالب اور اقبال اور اردو غزل کی روایت کے امین شاعر ہیں اور انھوں نے اس روایت کا دامن کبھی نہیں چھوڑا، بے شک انھوں نے زبان و بیان اور اسلوب کے کئی تجربات کیے مگر وہ کلاسیکی روایت سے ہمیشہ جڑے رہے راقم الحروف کی رائے میں ظفر اقبال روایت کا پاسبان بھی ہے مہم جو بھی اور نئی راہوں کا خُوگر بھی۔ ظفر اقبال نے دل کے استعارے کو اردو غزل کی روایت سے لیا اور اس میں جدت پیدا کی روایت میں اضافہ کیا ظفر اقبال کی استعارہ سازی راقم الحروف کے نزدیک شاعرانہ وجدان کے ساتھ ساتھ شعوری کوشش بھی ہے اور اس بات کی دلیل ظفر اقبال کے بعض اشعار ہیں جو باب سوم میں درج کیے گئے ہیں۔ ان اشعار میں استعارہ بطور لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ان اشعار سے واضح ہو جاتا ہے کہ ظفر اقبال استعارہ سازی کی اہمیت اور شعر میں استعارہ تراشنے کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں۔

ظفر اقبال کی غزل میں استعاراتی دنیائیں آباد ہیں اور نئی دنیاؤں کی آبادکاری اختراعی ذہن کی نشانی ہے۔ ظفر اقبال کا شعری مجموعہ ھے ھنومان مکمل استعاراتی اظہار ہے اور ہ راقم الحروف کے اس دعوے پر دال ہے کہ ظفر اقبال ایک مکمل استعاراتی نظام رکھتے ہیں۔ ہنومان ہمارے معاشرے کے ہر ایک کردار میں

ڈھلتا چلا جاتا ہے اور ہنومان کا استعارہ نئی معنویت پیدا کرتا جاتا ہے شاید اسی لیے شمس الرحمان فاروقی نے ہنو مان کے استعارے کو عمرو عیار کی زنبیل کہا ہے۔ ظفر اقبال کی استعارہ سازی کی بحث کے بعد اس باب میں ظفر اقبال کی غزل میں دل کے استعارے کی ان جہات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جو اردو غزل کی روایت کا دامن تھامے ہوئے ہیں ان روایتی جہات میں بھی ظفر اقبال نے تازگی، شگفتگی اور دل کشی پیدا کر دی ہے اور ان روایتی جہات کو بھی اپنے عہد سے ہم آہنگ کر دیا ہے کیونکہ ظفر اقبال بلا کا مشاہدہ رکھتے ہیں۔

دل کا مضمون اور دل بطور استعارہ ظفر اقبال کے ہاں بڑی کثرت سے استعمال میں لایا گیا ہے۔ ظفر اقبال کے پانچوں کلیات غزل میں ہزاروں اشعار دل کے حوالے سے ہیں۔

ظفر اقبال روایت سے فیض یاب ہوتے ہوئے دل کے استعارے کو عصری مسائل اور عہدِ حاضر سے جوڑتے چلے جاتے ہیں اور مضامین میں ڈھالتے جاتے ہیں راقم الحروف نے دل کا استعارہ روایت کے تناظر میں زیرِ بحث لاتے ہوئے زیادہ نمایاں اور تکرار کرتی ہوئی جہات پر تحقیق و تنقید کی ہے روایتی جہات میں دل گھر کے استعارے کے طور پر ظفر اقبال کے ہاں بار بار آتا ہے۔ کیونکہ ظفر اقبال کی شاعری کا بنیادی موضوع عصری انسان ہے عہد حاضر کا انسان مسائل کا شکار ہے اور حالات کی چکی میں پس رہا ہے دل کے استعارے کی روایتی جہات میں ظفر اقبال کے ہاں بہت اشعار میں دل عشق، محبت، جنون اور وحشت کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔

یوں ظفر اقبال دل کے استعارے کو مختلف خوش رنگ مفاہیم میں ڈھالتے جاتے ہیں۔ ظفر اقبال کے ہاں یہ استعاراتی جدت دیدہ زیب بھی اور قابل غور بھی۔

ظفر اقبال دل کو زندگی کی وسعت اور کائنات کے پھیلاؤ میں دیکھتے ہیں اور یوں دل کی معنویت بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ دل کبھی دریا، کبھی سمندر، کبھی صحرا کہیں دشت، کہیں کائنات کے مفاہیم میں اتنی خوبصورتی اور فن کارانہ چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں کہ ظفر اقبال کی شعر اور فن پر قدرت اور گرفت قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور معنی در معنی کھلتے چلے جاتے ہیں۔ تنقیدی جائزے کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ظفر اقبال نے دل کے استعارے کی روایتی جہات میں بھی بے شمار اضافہ کیا ہے اور اس روایت کا دامن کشادہ کیا ہے اور دل کے روایتی مضامین کو اس عہد سے جوڑ دیا ہے۔

باب چہارم یعنی آخری باب میں ظفر اقبال کی غزل میں دل کے استعارے کی متنوع جہات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اس باب میں ظفر اقبال کے اشعار کی روشنی میں یہ تجزیہ کیا گیا ہے کہ ظفر اقبال کی غزل میں دل ان کا کلیدی استعارہ ہے۔ دل ظفر کے ہاں عصر حاضر کے انسان کا استعارہ ہے یاد رہے کہ ظفر اقبال کی غزل کا مرکز و محور اور بنیادی موضوع بھی عہدِ حاضر کا انسان ہے۔

ظفر اقبال کی شاعری کا مرکزہ انسان ہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ عہدِ حاضر کا انسان ہے ظفر اقبال کے پانچوں کلیاتِ غزل اس دعوے کا بین ثبوت ہیں اور دلیل کے طور پر مقالے میں دل کے استعارے کے حوالے سے اشعار دیکھتے جا سکتے ہیں۔ ظفر اقبال کے عام فہم اشعار میں بھی بڑی گہرائی پائی جاتی ہے بعض اشعار پہلی نظر میں تو کھلتے ہی نہیں بلکہ عجیب لگتے ہیں مگر ذرا سی توجہ معانی کے کئی در وا کرتی جاتی ہے۔ ظفر اقبال نے دل کے استعاراتی اظہار میں دھنک رنگ بکھیر دیے ہیں۔

عہدِ حاضر کا انسان عجب مخمصے کا شکار ہے اک طرف جدیدِ سائنسی، ترقی یافتہ، صنعتی دنیا اور دوسری طرف انسان کی روحانی دنیا ہے۔ عہدِ حاضر کا انسان پنڈولم کی مانند ہے نظر کہیں اور جمی ہے اور دل کہیں اور قرار کا متلاشی ہے۔ رُوح تمام سہولیات اور آسائشات کے باوجود قرار نہیں پا رہی۔ ظفر اقبال دل کو روحانیت کی معنویت میں دیکھتے ہیں اور مائل بر تصوف ہیں۔ اپنی تمام جدت اور تنوع کے باوجود ظفر اقبال کا عہدِ حاضر کا انسان عرفان، تصوف، فقر اور روحانیت پسند ہے جبکہ وہ صنعتی اور مادی عہد میں سانس لے رہا ہے۔ گو عہد حاضر میں انسان مادی اور روحانی کشمکش کا شکار ہے۔ نہ وہ اس دنیا سے چھٹکارہ چاہتا ہے اور نہ ہی وجدانی و روحانی کیفیات سے عاری ہے۔

ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ جہاں جہاں روح کی معنویت دیتا ہے وہاں دل اور دنیا کی کشمکش بھی دکھائی دیتی ہے۔ ظفر اقبال کی غزل کے تنقیدی مطالعے کے دوران راقم الحروف کو دل و دنیا کی کشمکش ایک بڑا موضوع دکھائی دیتا ہے۔ یعنی مادی اور روحانی کشمکش مگر دنیا رُوح اور روحانیت پر حاوی دکھائی دیتی ہے۔ ظفر اقبال صوفی تو نہیں مگر ان کا رنگ جدید صوفیانہ ہے۔ بعض مقامات پر ظفر اقبال جلالی اور ملامتی صوفیا کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ پنڈت، مولوی پیر، فقیر کی بھد بھی اڑاتے ہیں۔

ظفر اقبال کی شاعری اور دل کے استعارے کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ پہلو کھل کر سامنے آیا ہے کہ ظفر اقبال کے ہاں خارجی اور داخلی دنیا میں زبردست معرکہ جاری ہے اور کہیں پناہ نہیں ملتی اور یہی اس عہد

کے انسان کا المیہ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ظفر اقبال دل کے استعارے کی معنویت کسی ان دیکھی روحانی دنیا کی تسخیر کی خواہش کی صورت لیتے ہیں اور دل کو چراغ راہ اور مرشد کامل کی جگہ دیکھتے ہیں۔ دل ان کے نزدیک تیرہ و تاریک راستوں میں وہ چمکتا ہوا ستارہ ہے جس سے راستے کا تعین کیا جا سکتا ہے دل ظفر اقبال کی غزل میں اس تجلی کا استعارہ بن کر ابھرتا ہے جو صوفیائے باصفا کو ہی نصیب ہوتی ہے اور کہیں دل، غارِ حرا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

کربلا اردو غزل کا ایک اہم موضوع رہا ہے، کربلا حق و باطل کے درمیان حد فاصل ہے۔ کربلا ضمیر کی آواز اور حریت کا استعارہ ہے سلام، مرثیہ، منقبت، نظم اور غزل میں کربلائی شاعری سے اردو شاعری چھلک رہی ہے۔ مقالے کے اس حصے میں میر تقی میرؔ، مومنؔ، ذوقؔ، غالبؔ، آتشؔ، جوہرؔ، اقبالؔ، فیضؔ، مجید امجدؔ منیر نیازیؔ، افتخار عارفؔ، صبا اکبر آبادیؔ، ثروت حسینؔ، محسن نقویؔ، اور دیگر شعرائے غزل کے ساتھ ساتھ غیر مسلم شعرا کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں اور ظفر اقبال کی غزل میں دل کو کربلا کے استعارے کی معنویت میں دیکھا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ ظفر اقبال کی غزل کا سب سے بڑا موضوع عصر نو کا انسان ہے تو ظفر اقبال کربلا کی روحانی جہات کے ساتھ ساتھ کربلا کو عصری انسان کی حالت زار اور سماجی جبر، دھشت گردی، قتل و غارت، عدم برداشت، زبان بندی، سیاسی استحصال، انسان کی بے توقیری کی ذیل میں دیکھتے ہیں۔ ظفر اقبال چشم زدن میں صدیوں کا سفر طے کرتے ہوئے ماضی میں جست لگا کر اس عہد کو کربلا سے جوڑ دیتے ہیں رقم الحروف کے خیال میں ظفر اقبال اپنے صحافتی مشاہدہ کی بدولت دوسرے ہم عصر شعرا کی نسبت اپنے ملک و قوم اور معاشرتی ابتری سے زیادہ واقف و آگاہ ہیں۔ کالم نگاری کی بدولت ان کا مشاہدہ دو آتشہ ہے۔ تیغ، تیر، تلوار، رسمِ وفا، موجِ فرات، سر، علم، دشت، خاک، بغاوت، دریائے گریہ صحرا، کا رواں، موجِ خوں، ریت، غریبی وغیرہ سب کربلائی استعارے ہیں اور متعلقاتِ کرب وبلا ہیں اور ظفر اقبال کی غزل ان استعاروں سے مزین ہے دل کے استعارے میں بھی یہ استعارے ظفر اقبال اتنی فنکارانہ مہارت سے ضم کرتے ہیں کہ دل کربلا کا استعارہ بن جاتا ہے اور معنیاتی امکانات کی کئی جہات کھلتی جاتی ہیں۔ ظفر اقبال کے خیال میں خیر و شر، حق و باطل، کی یہ قوتیں آج بھی برسر پیکار ہیں۔ ظفر اقبال کی غزل میں دل کے استعارے کی شعور کی یہ رو واضح دیکھی جا سکتی ہے اور اس سے ہماری معاشرتی صورت حال کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ مگر یہی کربلا انسان کو حوصلہ بھی عطا کرتی ہے اور ظفر یاب بھی۔ ان کے نزدیک خون حسینؑ

انسانیت کو روشن کر گیا اور امر ہو گیا اور ہی وجہ ہے کہ ظفر اقبال کے دل میں کربلا آباد ہے وہ اس سے طاقت کشید کرتے ہیں اور عہدِ حاضر کے انسان کو حسینی راستہ اختیار کرنے کا صائب مشورہ دیتے ہیں۔

ظفر اقبال جدید حسیت اور عصرِ حاضر کے انسان کی نمائندگی کرتے ہیں، عشق و محبت، معیشت، تہذیب، غربت تاریخ،نفسیات،سیاست،اخلاقیات روحانیت،ناانصافی،بے روزگاری، قتل و غارت گری وغیرہ ظفر اقبال کی غزل کے موضوعات ہیں اور یہ سب متعلقات انسانی ہیں۔ ظفر اقبال نے عہد نو کے انسان اور جدید حسیت کو دل قرار دیا ہے اور عصری صورت حال سے دو چار انسان کے احوال کی عکاسی کی ہے۔ اس کی خانگی ،شہری ،دیہاتی،معاشی،معاشرتی اور نفسیاتی الجھنوں کی تصویر کشی کی ہے۔ طبقاتی کشمکش،غربت،بے روزگاری ،عدم مساوات سے عہد حاضر کا انسان نبرد آزما ہے اور اس کا کوئی پرسان حال نہیں ظفر اقبال کبھی اس حالت زار پر کڑھتے ہیں کبھی ہنستے ہیں اور کبھی روتے دکھائی دیتے ہیں راقم الحروف کے خیال میں ظفر اقبال دل کو عصرِ حاضر کے جدید انسان کے استعارے کے ذریعے ان تمام مسائل کی نشاندہی کرتے دکھائی دیتے ہیں جن سے اس عہد کا انسان نبر دآزما ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں بینکوں بیمہ پالیسیوں، ڈیبٹ کارڈ سب سرمایہ دارانہ نظام کے وہ ہتھکنڈے ہیں جن میں اس عہد کا انسان جکڑا ہوا ہے۔ ظفر اقبال یہ تمام بھید کھولتے ہیں ۔ہوس زر کی خاطر ملک بدری خونی رشتوں سے دوری، وطن سے خود ساختہ جلا وطنی موضوعات ظفر اقبال ہیں۔

اعصابی تناؤ،ڈپریشن،اخلاقی گراوٹ، بے سکونی جدید انسان کے المیے ہیں جن کو ظفر اقبال دل کے استعارے کی جدید معنویت میں پروتے جاتے ہیں۔ ظفر اقبال کے ہاں استعارے کی معنویت مبہم نہیں بلکہ قرین قیاس ہے۔ اور ظفر اقبال جدید حسیت، عصری آگہی اور عصرِ حاضر کے انسان کے نباض ہیں۔

ظفر اقبال ایک قادرد الکلام شاعر ہیں۔ زبان و بیان پر انھیں دسترس حاصل ہے۔ الفاظ کا ممکنہ استعمال ان کا خاصا ہے۔ لفظ کی نئی معنویت کی تلاش ان کی منزل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے استعارے کئی مفاہیم کھولتے چلے جاتے ہیں اور دل کے استعارے کا پھیلاؤ انسانی زندگی جیسا ہے۔

سیر حاصل بحث، تحقیق و تنقید اور تجزیے سے یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ، ان کا کلیدی استعارہ ہے جس کی کئی جہات،مفاہیم اور تعبیریں اور تفسیریں ہیں مگر دل

کے استعارے کی کلیدی جہت عصرِ حاضر کا انسان ہے۔ ظفر اقبال کی غزل میں دل کا استعارہ ظفر اقبال کے اس شعر کے مصداق ہے۔

آسماں پر کوئی تصویر بناتا ہوں ظفرؔ
کہ رہے ایک طرف اور، لگے چاروں طرف

سفارشات:

ظفر اقبال کی غزل کے مطالعے کے دوران راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ظفر اقبال پر جامعات کی سطح پر تحقیقی و تنقیدی کام کم ہوا ہے ۔ظفر اقبال پر اس حوالے سے تحقیقی و تنقیدی کام کی اشد ضرورت ہے تا کہ ظفر اقبال جیسے اہم شاعر کی غزل کے تمام اہم پہلو منظرِعام پر لائے جا سکیں، لہٰذا چند سفارشات مرتب کی جاتی ہیں تا کہ تحقیق و تنقید کے میدان میں آنے والے نئے محقق طالبِ علم فیض یاب ہو سکیں۔

۱۔ ظفر اقبال کی غزل میں عائلی زندگی کے اشارے

۲۔ ظفر اقبال کی غزل میں ہنومان کا استعارہ

۳۔ ظفر اقبال کی غزل میں علمِ بیان و بدیع

۴۔ ظفر اقبال کی غزل میں دیگر زبانوں کے الفاظ اور وسعتِ زبان کی سعی

۵۔ ظفر اقبال کے شعری مجموعوں کے بدلتے ذائقے: تحقیق و تنقید

۶۔ موضوعات ظفر اقبال: تحقیق و تنقید

۷۔ ظفر اقبال کی غزل کا عروضی ،فکری و فنی مطالعہ

۸۔ ظفر اقبال لا تنقید اور شعرِ ظفر اقبال

۹۔ ظفر اقبال کی غزل میں طنز و مزاح کے عناصر

۱۰۔ ظفر اقبال کی غزل میں دریا،صحرا،دشت کا استعارہ

۱۱۔ ظفر اقبال ،رد تعلی کا شاعر

۱۲۔ کلام ظفر اقبال میں تہذیبی و سماجی زندگی کے عناصر

کتابیات

بنیادی ماخذ :

- ظفر اقبال، اب تک(کلیاتِ غزل)، جلد اول، ملٹی میڈیا افئیرز، لاہور، ۲۰۰۴ء
- ظفر اقبال، اب تک(کلیاتِ غزل)، جلد دوم، ملٹی میڈیا افئیرز، لاہور، ۲۰۰۵ء
- ظفر اقبال، اب تک(کلیاتِ غزل)، جلد سوم، ملٹی میڈیا افئیرز، لاہور، ۲۰۰۶ء
- ظفر اقبال، اب تک(کلیاتِ غزل)، جلد چہارم، ملٹی میڈیا افئیرز، لاہور، ۲۰۱۲
- ظفر اقبال، اب تک(کلیاتِ غزل)، پنجم، رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۶ء
- ظفر اقبال، خِشت زعفران، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۷ء
- ظفر اقبال، دال دلیا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء
- ظفر اقبال، لاتنقید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۴ء

کلیاتِ اُردو میں شامل مجموعے

- ظفر اقبال، آبِ رواں، مشمولہ، اب تک،(کلیاتِ غزل) جلد اول، ملٹی میڈیا افئیرز، لاہور ۲۰۰۴ء
- ظفر اقبال، گلافتاب، مشمولہ، اب تک،(کلیاتِ غزل) جلد اول، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور ۲۰۰۴ء
- ظفر اقبال، رطب و یابس، مشمولہ، اب تک،(کلیاتِ غزل) جلد اول، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور ۲۰۰۴ء
- ظفر اقبال، غبار آلود سمتوں کا سراغ، مشمولہ، اب تک،(کلیاتِ غزل) جلد اول، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور ۲۰۰۴ء
- ظفر اقبال، سرِ عام، مشمولہ، اب تک،(کلیاتِ غزل) جلد اول، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور ۲۰۰۴ء

- ظفر اقبال، عیب و ہنر، مشمولہ، اب تک، (کلیاتِ غزل) جلد اول، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور ۲۰۰۴ء
- ظفر اقبال، وہم و گماں، مشمولہ، اب تک، (کلیاتِ غزل)، جلد دوم ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۵ء
- ظفر اقبال، اطراف، مشمولہ، اب تک، (کلیاتِ غزل)، جلد دوم ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۵ء
- ظفر اقبال، ہے ہنومان، مشمولہ، اب تک، (کلیاتِ غزل)، جلد دوم ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۵ء
- ظفر اقبال، تفاوت، مشمولہ، اب تک، (کلیاتِ غزل)، جلد دوم ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۵ء
- ظفر اقبال، ترتیب، مشمولہ، اب تک، (کلیاتِ غزل)، جلد دوم ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۵ء
- ظفر اقبال، تماشا، مشمولہ، اب تک، (کلیاتِ غزل)، جلد دوم ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۵ء
- ظفر اقبال، تمجید، مشمولہ، اب تک، (کلیاتِ غزل)، جلد سوم، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۶ء
- ظفر اقبال، تقویم، مشمولہ، اب تک، (کلیاتِ غزل)، جلد سوم، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۶ء
- ظفر اقبال، تشکیل، مشمولہ، اب تک، (کلیاتِ غزل)، جلد سوم، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۶ء
- ظفر اقبال، تجاوز، مشمولہ، اب تک، (کلیاتِ غزل)، جلد سوم، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۶ء
- ظفر اقبال، توارد، مشمولہ، اب تک، (کلیاتِ غزل)، جلد سوم، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۶ء
- ظفر اقبال، تساہل، مشمولہ، اب تک، (کلیاتِ غزل)، جلد سوم، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۶ء
- ظفر اقبال، تنسیخ، مشمولہ، اب تک، (کلیاتِ غزل)، جلد چہارم، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۱۲ء
- ظفر اقبال، تحلیل، مشمولہ، اب تک، (کلیاتِ غزل)، جلد چہارم، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۱۲ء
- ظفر اقبال، تقلیل، مشمولہ، اب تک، (کلیاتِ غزل)، جلد چہارم، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۱۲ء

- ظفر اقبال، تخفیف،مشمولہ،اب تک،(کلیاتِ غزل)،جلد چہارم،ملٹی میڈیا افیئرز ،لاہور،۲۰۱۲ء
- ظفر اقبال، ترکیب،مشمولہ،اب تک،(کلیاتِ غزل)،جلد چہارم،ملٹی میڈیا افیئرز ،لاہور،۲۰۱۲ء
- ظفر اقبال، تشکیک،مشمولہ،اب تک،(کلیاتِ غزل)،جلد چہارم،ملٹی میڈیا افیئرز ،لاہور،۲۰۱۲ء
- ظفر اقبال،تادیب، مشمولہ،اب تک،(کلیاتِ غزل)،جلد پنجم ،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۱۶ء
- ظفر اقبال،تنصیب، مشمولہ،اب تک،(کلیاتِ غزل)،جلد پنجم ،رنگ ادب پبلی کیشنز ،کراچی،۲۰۱۶ء
- ظفر اقبال،توسیع، مشمولہ،اب تک،(کلیاتِ غزل)،جلد پنجم ،رنگ ادب پبلی کیشنز ،کراچی،۲۰۱۶ء
- ظفر اقبال،تفریق، مشمولہ،اب تک،(کلیاتِ غزل)،جلد پنجم ،رنگ ادب پبلی کیشنز ،کراچی،۲۰۱۶ء
- ظفر اقبال،ترمیم، مشمولہ،اب تک،(کلیاتِ غزل)،جلد پنجم ،رنگ ادب پبلی کیشنز ،کراچی،۲۰۱۶ء
- ظفر اقبال،تجویز، مشمولہ،اب تک،(کلیاتِ غزل)،جلد پنجم ،رنگ ادب پبلی کیشنز ،کراچی،۲۰۱۶ء
- ظفر اقبال، توفیق، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۷ء
- ظفر اقبال، تاخیر، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۸ء

ثانوی ماخذ:

- آفتاب حسین، مطلع، کتاب نما، لاہور، ۱۹۹۶ء
- ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، اردو غزل کا تکنیکی، ہئیتی اور عروضی سفر، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء
- ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، اصنافِ ادب تفہیم و تعبیر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء
- الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، کشمیر کتاب گھر اردو بازار، لاہور، س۔ن۔
- انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۶ء
- انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور، ۲۰۰۶ء
- انور جمال، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۸
- انیس ناگی، نئی شاعری، عالمی پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۶۹ء
- انتظار حسین، علامتوں کا زوال، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، ۱۹۸۳ء
- جاوید شاہین (مرتب)، آٹھ غزل گو مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۸۲ء
- دلاور علی آذر، (انتخاب)، ظفر یاب، رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی ۲۰۱۵ء
- رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصنافِ ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء
- سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۹ء
- سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، مغرب کے تنقیدی اصول، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء
- سید عبداللہ، ڈاکٹر، ولی سے اقبال تک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء
- شمس الرحمٰن فاروقی، شعرِ شور انگیز، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (تیسرا ایڈیشن)، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء

- شبلی نعمانی،شعر العجم،دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی،اعظم گڑھ، جلد چہارم،طبع جدید،۲۰۰۷ء
- طارق ہاشمی،اردو غزل نئی تشکیل، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد،۲۰۰۸ء
- عابد علی عابد،اسلوب، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۸۰ء
- عابد علی عابد،البیان، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۶ء
- غالبؔ،اسد اللہ بیگ خان،دیوانِ غالب، نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد،۲۰۱۴ء
- قاسم یعقوب،تنقید کی شعریات،پورب اکادمی،اسلام آباد،۲۰۱۴ء
- گوپی چند نارنگ،ڈاکٹر،سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۱ء
- محمد اقبال،کلیاتِ اقبال،اقبال اکادمی،لاہور،۲۰۰۲ء
- محمد ہادی حسین،زبان اور شاعری، مجلس ترقی ادب لاہور،۱۹۸۴ء
- محمد حسن عسکری،مجموعہ محمد حسن عسکری،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۱۹۹۴ء
- مرزا سجاد بیگ،دہلوی، تسہیل البلاغت، محبوب المطابع، برقی پریس،دہلی،س۔ن
- مزمل حسین،ڈاکٹر،حدائق البلاغت،مثال پبلشرز،فیصل آباد،۲۰۰۹ء
- ممتاز حسین،ادب اور شعور،ایجوکیشنل پریس،کراچی،بارِاول ۱۹۶۱ء
- میر تقی میرؔ،کلیاتِ میر،(مرتبہ)کلب علی خان فائق، مجلس ترقی ادب،لاہور،۱۹۸۶ء
- نظیر صدیقی،جدید اردو غزل.ایک مطالعہ،گلوب پبلشرز،لاہور ۱۹۸۴
- نجم الغنی رامپوری، مولوی، بحر الفصاحت، مقبول اکیڈمی،لاہور ۱۹۸۹
- نواز ش علی،ڈاکٹر،(مرتبہ)عبارت،پاکستان میں اردو کے پچاس سال،دھنک پرنٹرز،راولپنڈی ۱۹۹۷ء

- ناصر عباس نیر،ڈاکٹر،مجید امجد:شخصیت اور فن،اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد،۲۰۰۸ء
- یوسف حسین خاں،ڈاکٹر، اردو غزل،آئینہ ادب،لاہور،۱۹۶۴

جرائد ورسائل:

- ادبیات،شمارہ نمبر ۷۲، نگران اعلیٰ: افتخار عارف، مجلس ادارت: محمد عاصم بت، ڈاکٹر راشد حمید، علی یاسر،اکادمی ادبیات،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد، جولائی۔ستمبر ۲۰۰۶ء
- انگارے،(ظفر اقبال نمبر)،کتابی سلسلہ نمبر۴۸، مرتبہ : سید عامر سہیل، گل گشت کالونی،ملتان، دسمبر ۲۰۰۶ء
- تلازمہ، شمارہ نمبر۱، مدیران: حسنین سحر، کنور امتیاز احمد، تلازمہ پبلشنگ گلبرگ، لاہور، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۰ء
- دنیازاد، شمارہ نمبر۱۹، ترتیب: آصف فرخی، شہرزار، کراچی ۲۰۰۹ء
- ذہنِ جدید، شمارہ نمبر۵۹، مرتبہ: زبیر رضوی، نئی دہلی دسمبر ۲۰۱۰ء تا فروری ۲۰۱۱ء
- ماہِ نو، جلد ۵۷، ادارت: پروین ملک، صفدر بلوچ، شمارہ نمبر ۹/۱۰، ادارہ مطبوعات پاکستان، لاہور، ستمبر۔اکتوبر ۲۰۰۴ء
- معاصر، جلد۱، شمارہ نمبر۱، ادارت: عطاالحق قاسمی، لاہور: ۱۹۷۹ء
- نزول ،(ظفر اقبال نمبر) شمارہ نمبر۸، ادارت: سید اذلان شاہ، گوجرہ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ، دسمبر ۲۰۱۳ء

فرہنگ اور لغات:

- عبدالحق و ابواللیث صدیقی،(مولفین)اردو لغت تاریخی اصول، اردو دکشنری بورد، کراچی ۱۹۸۳ء

- سید تصدق حسین رضوی، مولوی، لغاتِ کشوری، مطبع نامی منشی نول کشور، لکھنو، طبع ۱۹، ۱۹۵۲ء
- محمد پادشاہ، (مولف) فرہنگِ آنندراج، کتاب فروشی خیام، تہران، ۱۳۳۵ھ
- احمد دہلوی سید، مولوی، فرہنگ آصفیہ، اردو سائنس بورڈ، لاہور ۱۹۸۷ء
- شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۵ء
- محمد عبداللہ خان، خویشگی، مولف فرہنگ عامرہ ٹائمز پریس، کراچی، ۱۹۵۷ء
- نور الحسن نیر، مولوی، نور اللغات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور ۱۹۸۵ء

غیر مطبوعہ مقالات:

- انعم الہیٰ بھٹہ، ظفر اقبال کے مجموعۂ کلام ،آبِ رواں کا تنقیدی جائزہ، تحقیقی مقالہ، بی، اے آنرز، مملوکہ، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۵۔۲۰۱۱
- قاضی عطاالرحمٰن، ظفر اقبال کی شاعری میں لسانی تجربات و تشکیلات،، مملوکہ بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۲۰۰۰ء۔۱۹۹۸ء
- محمد امین شاہ، فرہنگ کلامِ ظفر اقبال، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل، مملوکہ، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء
- منیبہ زہرا نقوی، ظفر اقبال کی شاعری میں لسانی تجربات کا تحقیقی مطالعہ، برائے ایم فل مملوکہ یونیورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۱۵ء